اسلام کی حقانیت

معروف بہ "حجۃ الاسلام"

حجۃ الاسلام حضرت مولانا

محمد قاسم صدیقی نانوتوی قدس سرہ

بانی دار العلوم دیوبند

پیشکش

مدثر جمال تونسوی

دار البصائر۔ بہاولپور

تعارف کتاب

از قلم: شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ

نوٹ: استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کا یہ مضمون ان کی کتاب ''تبصرے'' سے ماخوذ ہے۔

یہ مضمون دراصل ''حجۃ الاسلام'' کی شرح مولفہ مولانا اشتیاق احمد دیوبندی کے تعارف اور تبصرے کے لئے لکھا گیا تھا، شرح سے متعلقہ حصہ حذف کر کے اصل کتاب سے متعلقہ تعارف کو یہاں درج کیا گیا ہے جو اس کتاب کے اجمالی تعارف اور اس کی طرف رغبت پیدا کرنے کے لئے انتہائی مفید ہے۔

مدثر جمال تونسوی

۱۴/۳/۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی علمی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے، یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج برصغیر پاک و ہند میں جہاں جہاں علم دین کی کوئی کرن نظر آتی ہے، وہ زیادہ تر اسی آفتاب علم کا پرتو ہے، بحر حکمت کے اس شناور کو اللہ نے جو علوم و معارف عطا فرمائے تھے ان کی نظیر اس آخری دور میں خال خال ہی ہے، اس مرد با خدا نے اس زمانے میں ہندوستان کے اندر حق کا آواز و بلند کیا تھا جب وہاں حق کے پرستاروں کے لئے دار کے تختے لگے ہوئے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں تلوار کا جہاد بھی کیا، قلم کا بھی اور زبان کا بھی اور آخر میں دیوبند کے اندر "دارالعلوم" کے نام سے ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کر دیا جس نے ایک عالم کو سیراب کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

''حجۃ الاسلام'' حضرت نانوتویؒ کی وہ تصنیف ہے جسے آپ نے چوبیس گھنٹے کی ایک فرصت میں قلم برداشتہ تحریر فرمایا تھا، اصل میں یہ ایک تقریر تھی جو آپ نے چاندا پور کے میلۂ خدا شناسی کے لئے لکھی تھی، یہ میلہ 1876ء کو انگریزوں نے عیسائیت کی ترویج کیلئے ضلع شاہجہاں پور کے ایک رئیس پیارے لال کبیر منتھی کو آلۂ کار بنا کر منعقد کیا تھا اور اس میں ہر مذہب والے کو اپنے مذہب کی تشریح کی دعوت

دی گئی تھی، انگلستان کا ایک شعلہ بیان مقرر پادری نولس اس میلے کا کمانڈر اعلیٰ تھا۔

اس میلے کی دلچسپ روداد "میلۂ خدا شناسی" کے نام سے الگ چھپ چکی ہے، مختصر یہ کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دلائل کے زور، ایمان کی قوت اور انداز بیان کی سحر انگیزی سے اس پورے میلے پر اس طرح چھا گئے تھے کہ غیر مسلموں نے بھی آپ کو اس میلہ کا فاتح قرار دیا۔

حضرت نانوتویؒ کو اس مجلس میں شرکت کا دعوت نامہ عین وقت پر پہنچا تھا، اور آپ نے ایک دن ایک رات میں بیٹھ کر یہ تقریر لکھی تھی۔ "میلۂ خدا شناسی" میں تو آپ نے تمام تقریر زبانی ہی فرمائی، لیکن یہ تقریر بعد میں دار العلوم دیوبند سے "حجۃ الاسلام" کے نام سے شائع ہوئی۔

اس تقریر کو بلاشبہ "دریا بکوزہ" کہا جا سکتا ہے، اس میں حضرت نانوتویؒ نے تقریباً تمام اسلامی عقائد کو مختصر مگر دل نشین اور مستحکم دلائل کے ساتھ اس خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے کہ اس کا ایک ایک صفحہ عقل اور دل کو بیک وقت اپیل کرتا ہے، خدا کے وجود، توحید، اولاد سے بے نیازی، ابطالِ تثلیث، مسئلۂ تقدیر، جبر و قدر، عباداتِ بدنی و مالی کے فلسفے، اثباتِ رسالت و عصمتِ انبیاء، شفاعت، ابطالِ کفارہ، مدارِ نبوت، معجزات، اعجازِ قرآن، تحقیقِ نسخ، معجزۂ شق قمر، حلتِ گوشت، حرمتِ مردار، طریقۂ ذبحِ اسلامی، ان میں سے ہر ایک مسئلے پر اس تقریر میں مدلل

کلام موجود ہے، دلائل اتنے واضح کہ عقل مطمئن ہوتی چلی جائے، اور انداز بیان اتنا دل نشین کہ براہ راست دل پر اثر انداز ہو، ایک ایک سطر سے مصنف کا یہ یقین اور اعتماد ٹپکتا ہے کہ اسلام ہی دینِ حق ہے۔ مصنف رحمہ اللہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دقیق فلسفیانہ باتوں کو گرد و پیش کی خارجی مثالوں سے اس طرح واضح فرماتے ہیں کہ وہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں، ''خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہو سکتا'' اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اپنے گھر اگر بندر یا سور کی شکل کا لڑکا پیدا ہو جائے تو کس قدر رنجیدہ ہوں کہ الٰہی پناہ! حالانکہ بندر اور سور اور آدمی، اور بھی کچھ نہیں تو مخلوق ہونے اور کھانے پینے اور بول و براز میں تو شریک ہیں، اور خدا کے لئے ایسی اولاد تجویز کریں جس کو کچھ مناسبت ہی نہ ہو۔ تم ہی فرماؤ کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو، بول و براز سے مجبور ہو، اس میں اور خدا میں کون سی بات کا اشتراک ہے جو خدا کا بیٹا یا خدا کہتے ہو؟''

انبیاء کی ضرورت اور ان کے معصوم ہونے کو کس لطیف پیرائے میں بیان فرماتے ہیں:

''بادشاہانِ دُنیا اس تھوڑی سی نخوت پر اپنے ہی بنی نوع سے نہیں کہتے، دُکان دُکان اور مکان مکان پر کہتے نہیں پھرتے، مقربانِ بارگاہ ہی سے کہہ دیتے ہیں، وہ اوروں

کو سنا دیتے ہیں، اور بذریعۂ اشتہارات و منادی اعلان کرا دیتے ہیں، خداوند عالم کو ایسا کیا کم سمجھ لیا ہے کہ وہ ہر کسی سے کہتا پھرے، وہاں بھی یہی ہوگا کہ اپنے مقربوں سے اور خواصوں سے فرمائے اور وہ اوروں کو پہنچائیں، ایسے لوگوں کو اہل اسلام انبیاء اور پیغمبر اور رسول کہتے ہیں۔

لیکن دُنیا کے تقرب اور خواصی کے لئے سراپا اطاعت ہونا ضرور ہے، اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے؟ اور مسندِ قرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے؟ اس لئے یہ ضرور ہے کہ وہ مقرب جن پر اسرار و مافی الضمیر آشکار کیے جائیں یعنی اصول احکام سے اطلاع دی جائے، ظاہر و باطن میں مطیع ہوں، مگر جس کو خداوند علیم و خبیر باعتبار ظاہر و باطن مطیع و فرمانبردار سمجھے گا۔ اس میں غلطی ممکن نہیں، البتہ بادشاہان دُنیا موافق و مخالف و مطیع و عاصی و مخلص و مکار کے سمجھنے میں بسا اوقات غلطی کھا جاتے ہیں..... مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ کے مقرب بوجہ عدم امکان غلط فہمی ہمیشہ مطیع و مقرب ہی رہیں گے بنظر بریں یہ لازم ہے کہ انبیاء معصوم بھی ہوں"۔

اعجاز قرآن کریم پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علاوہ بریں عبارتِ قرآنی ہر کس و ناکس رند بازاری کے نزدیک بھی اسی طرح اور عبارتوں سے ممتاز ہوتی ہے جیسے کسی خوش نویس کا خط بدنویس کے خط سے، پھر جیسے تناسب خد و خال معشوقان اور تناسب حروف خط خوش نویسان معلوم ہو جاتا ہے اور پھر

کوئی اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے، ایسے ہی تناسب عبارت قرآنی...... ہر کسی کو معلوم ہو جاتا ہے، پر اس کی "حقیقت" اس سے زیادہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے"۔

معجزۂ "شق قمر" پر بطلیموسی یا جدید فیثاغوری فلکیات کی رو سے جو اعتراضات ہو سکتے تھے اس پر مفصل اور فاضلانہ گفتگو کے بعد اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ:

"کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر انشقاق قمر ہوا ہوتا تو سارے جہان میں شور پڑ جاتا، تاریخوں میں لکھا جاتا"

تحریر فرماتے ہیں:

"علاوہ بریں طلوع قمر کے تھوڑی دیر کے بعد یہ قصہ واقع ہوا، اس لئے کہ جبل حرا کے دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں حائل ہو جانے کا مذکور ہے، اس صورت میں ممالک مغرب میں تو اس وقت تک عجب نہیں طلوع بھی نہ ہوا ہو اور بعض مواقع میں عجب نہیں کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کی آڑ میں آ گیا ہو اور اس لئے انشقاق قمر اس جا پر محسوس نہ ہوا ہو، ہاں! ہندوستان میں اس وقت ارتفاع قمر البتہ زیادہ ہوگا اور اس لئے وہاں اور جگہ کی نسبت اس کی اطلاع کا زیادہ احتمال ہے، مگر جیسے اس وقت ہندوستان میں ارتفاع قمر زیادہ ہوگا ویسا ہی اس وقت رات بھی آدھی ہوگی اور ظاہر

ہے اس وقت کون جاگتا ہوتا ہے۔
سوا اس کے ہندوستانیوں کو قدیم سے اس طرح توجہ ہی نہیں تھی کہ تاریخ لکھا کریں، بااین ہمہ تاریخوں میں وارد ہے کہ یہاں کے ایک راجہ نے ایک رات یہ واقعہ بچشم خود دیکھا تھا"۔

یہ "مشتے نمونے از خروارے" ہے، پوری کتاب کا حال یہی ہے کہ اسے پڑھ کر دل کو اطمینان کی دولت میسر آتی ہے اور قلب و دماغ کے دریچے کھلتے ہیں، کتاب مجموعی طور پر عام فہم ہے لیکن بعض جگہ دقیق مباحث بھی آ گئے ہیں......

کتاب کے شروع میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کا ایک مختصر مقدمہ ہے جس میں کتاب کی تصنیف کا واقعہ مذکور ہے۔

بلاشبہ "حجۃ الاسلام" ایسی کتاب ہے کہ اسے گھر گھر پھیلنا چاہیے، مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں طبقوں میں اس کی خوب نشر و اشاعت ہونی چاہیے، نیز ضرورت ہے کہ اس کتاب کے دوسری زبانوں بالخصوص عربی اور انگریزی میں ترجمے کئے جائیں......ہم اپنے قارئین سے اس کتاب کے مطالعے کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

(ماخوذ از تبصرے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب

قدس اللہ سرہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الرسل وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ واحبابہ وعلماء امتہ الواصلین الی مدارج الحق والیقین۔

بندہ محمود، حمد وصلوٰۃ کے بعد طالبان معارف الہیہ اور دلدادگان اسرار وملت حنفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہجہاں پور نے باتفاق رائے جب ایک میلہ بنام میلہ "خدا شناسی" موضع چاندا پور میں مقرر کیا، اور اطراف و جوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں۔ تو اس وقت معدن الحقائق مخزن الدقائق مجمع المعارف، مظہر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم والخیرات، سیدی ومولائی حضرت مولانا مولوی محمد قاسم متعنا اللہ تعالیٰ بعلومہ ومعارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ یعنی ۷ مئی سر پر آگئی تھی۔ چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ تحقیق مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی ہے؟ اعتراضات وجوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی اپنے اپنے مذہب

کی حقانیت بیان یا بیانات تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے۔ تو اسی لیے بغرض احتیاط حضرت
مولانا قدس اللہ سرہ کے خیال مبارک میں یہ آیا کہ ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ
بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو حسب قواعد عقلیہ منضبط ہونی چاہیے
جس کی تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔ چونکہ
وقت بہت تنگ تھا اسی لیے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ
کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔ جلسۂ مذکورہ میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکورہ کو زبانی ہی بیان
فرمایا اور در بارۂ حقانیت اسلام جو کچھ بھی فرمایا وہ زبانی ہی فرمایا۔ اور اسی لیے تحریر مذکور کے
سنانے کی حاجت اور نوبت ہی نہ آئی۔ چنانچہ مباحثۂ مذکور کی جملہ کیفیت بالتفصیل چند بار طبع
ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ مگر جب اس مجمع سے بحمد اللہ نصرت اسلام کا علم پھر اڑاتے ہوئے
حضرت مولانا المعظم واپس تشریف لائے تو بعض خدام نے عرض کیا کہ تحریر جو جناب نے
تیار فرمائی تھی اگر مرحمت ہو جائے تو اس کو مشتہر کر دینا نہایت ضروری اور مفید نظر آتا ہے۔ یہ
عرض مقبول ہوئی اور تحریر مذکور متعدد مرتبہ طبع ہو کر اس وقت تک تسکین بخش قلوب اہل بصیرت
اور نور افزائی دیدۂ اولی الابصار ہو چکی ہے اور مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ تعالیٰ (علیہ) نے
اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام "حجۃ الاسلام" تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا، جس
کی وجہ تسمیہ دریافت کرنے کی کم فہم کو بھی حاجت نہ ہوگی۔ اس کے بعد چند مرتبہ مختلف مطابع
میں چھپ کر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی۔ صاحبان مطابع اس رسالۂ مقبولہ اور نیز دیگر تصانیف
حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر صرف بغرض تجارت معمولی طور پر ان کو چھاپتے
رہے۔ کسی زائد اہتمام کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی۔ اس لیے فقط کاغذ اور لکھائی اور چھپائی ہی

"حکمت قاسمیہ" کا پہلا حکمت علمی شاہکار

اسلامی عقائد و نظریات کے اثبات میں لاجواب تحریر

حجۃ الاسلام

قاسم العلوم والخیرات

مولانا محمد قاسم صدیقی نانوتوی نوراللہ مرقدہ

بانی دارالعلوم دیوبند

دارالبصائر۔ بہاولپور

m.ahmad1431@gmail.com

میں کوتاہی نہیں ہوئی بلکہ صحیح عبارت میں بھی نمایاں خلل پیدا ہو گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر کوشش برادران قاسمی اور دلدادگان اسرار علمی کو بے اختیار اس امر پر کمربستہ ہونا پڑا کہ صحت، خوش خطی وغیرہ تمام امور کا اہتمام کر کے اس مجلد مقدسہ کو چھاپا جائے اور بغرض توضیح حاشیہ پر ایسے نشانات کر دیئے جائیں جس سے تفصیل مطالب ہر کسی کو معلوم ہو جائے۔ اور جملہ تصانیف حضرت مولانا نفع اللہ المسلمین بطول بقائہ کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں سعی کی جائے۔

اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ جو مضامین "تقریر دلپذیر" میں بیان کرنے کا ارادہ ہے، وہ سب اس تحریر میں آ گئے۔ اس قدر تفصیل سے نہ سہی بالاجمال ہی سہی۔ ایسی حالت میں "تقریر دلپذیر" کے تمام ہونے کا جو قلق شائقان اسرار علیہ کو ہے اس کے مکافات کی صورت بھی اس رسالہ سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔ اب طالبان حقائق اور حامیان اسلام کی خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ تائید احکام اسلام اور مدافعت فلسفۂ قدیمہ وجدیدہ کے لیے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء کے رسائل کے مطالعہ میں بھی کچھ وقت ضرور صرف فرماویں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانہ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق اور بہتر اور مفید تر ہیں یا نہیں۔ اہل فہم خود اس کا تجربہ کچھ تو کر لیں میرا کچھ عرض کرنا اس وقت غالبا دعویٰ بلا دلیل سمجھ کر غیر معتبر ہوگا۔ اس لیے زیادہ عرض کرنے سے معذور ہوں۔ اہل فہم وعلم خود موازنہ اور تجربہ فرمانے میں کوشش کر کے فیصلہ کر لیں۔ باقی خدام مدرسہ عالیہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بنام خدا کر لیا ہے کہ تالیفات موصوف مع بعض تالیفات

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ وغیرہ، تصحیح اور کسی قدر توضیح و تسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کرا اور نصاب تعلیم میں داخل کر کے ان کی ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے تو جان توڑ کر ہر طرح سعی کی جائے، اور اللہ کا فضل حامی ہو تو وہ نقشہ جو ان کے ذہن میں ہے اوروں کو بھی اس کے جمال سے کامیاب کیا جائے۔

ولاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں، جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

....

....

انما انا قاسم واللہ یعطی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبحانک لاعلم لنا الاما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

تمہید

اے حاضران جلسہ! یہ کمترین اور آپ صاحب بلکہ تمام بنی آدم اول سے ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، اسی لیے ہر کسی کے ذمہ ایک دوسرے کی خیر خواہی لازم ہے اور دوسروں کے مطالب اصلیہ کے بہم پہنچانے میں کوشش کرنی سب کے ذمہ ضرور ہے۔ مگر جیسے آنکھ، ناک کا مطلب اصلی دیکھنا، سونگھنا اور زبان، کان کا مطلب اصلی بولنا، سننا ہے ایسے ہی ہر بنی آدم کا مطلب اصلی اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ وجہ اس مشابہت کی یہ ہے کہ جیسے آنکھ، ناک، کان، زبان وغیرہ دیکھنے، سونگھنے، سننے، بولنے کے لیے بنائی ہے ایسے ہی بنی آدم بھی خدا کی اطاعت کے لیے بنائے گئے ہیں۔

انسان اشرف المخلوقات ہے

شرح اس کی مجھ سے سنئے۔ زمین سے لے کر آسمان تک جس چیز پر سوائے انسان کے نظر پڑتی ہے وہ انسان کے کارآمد نظر آتی ہے۔ پر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نظر نہیں آتا۔ دیکھئے زمین، پانی، ہوا، آگ، چاند، سورج، ستارے اگر نہ ہوں تو جینا محال یا دشوار ہو جائے، اور ہم نہ ہوں تو اشیاء مذکورہ میں سے کسی کا کچھ نقصان نہیں۔ علی ہذا القیاس درخت، جانور وغیرہ مخلوقات اگر نہ ہوتے تو ہمارا کچھ نہ کچھ حرج ضرور تھا۔ کیونکہ اور بھی کچھ نہیں تو یہ اشیاء کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مرض ہی کی دوا ہو جاتی ہیں۔ پر ہم کو دیکھئے کہ ہم ان کے

حق میں کسی مرض کی دوا نہیں۔ مگر جب ہم مخلوقات میں سے کسی کے کام کے نہیں تو بالضرور ہم اپنے خالق کے کام کے ہوں گے ورنہ ہماری پیدائش محض فضول اور بے ہودہ ہو جائے۔ جس سے خالق کی طرف تو بے ہودہ کاری کا الزام عائد ہو اور ہماری طرف نکمے ہونے کا عیب راجع ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ کوئی عاقل سے عاقل ان کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور کیوں کر تسلیم کر لیجئے بدلالت آثار و کاروبار انسانی، انسان کی افضلیت اور مخلوقات پر خصوصاً جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ اشیائے معلومہ محسوسہ پر ایسی طرح روشن ہے جیسے خوبصورتوں کا بدصورتوں پر صورت میں افضل ہونا، اور خوش آوازوں کا بدآوازوں سے آواز میں افضل ہونا، اور خوش فہموں کا بدفہموں سے فہم میں افضل ہونا ظاہر و باہر ہے۔ پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اور سب چیزیں تو کام کی ہوں اور انسان نکما ہو۔ اور اشیاء اگر انسان کے کام کی ہیں تو انسان بے شک خدا کے کام کا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا

علاوہ بریں سب صاحبوں سے پوچھتا ہوں، یہ تو غلط نہ ہو کہ آگ جلایا ہی کرتی ہے بجھاتی نہیں، اور پانی بجھایا ہی کرتا ہے جلاتا نہیں، اور یہ غلط ہو جائے کہ حکیم علی الاطلاق حکمت ہی کے کام کیا کرتا ہے، کوئی بے ہودہ کام نہیں کرتا۔ بے شک جیسے آگ جلاتی ہے، بجھاتی نہیں۔ ایسے ہی حکیم علی الاطلاق بھی حکمت ہی کے کام کرے گا۔ بے ہودہ کام اُس سے سرزد نہ ہوں گے۔

پھر کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انسان کو محض فضول بنایا ہو اُس کے بنانے میں کوئی حکمت نہ ہو۔ یعنی اُس کے بنانے میں کوئی نتیجہ مقصود نہ ہو محض نکما ہی ہو۔ ہاں اگر خالق کا حکیم

ہوتا قابل تسلیم نہ ہوتا تو البتہ کچھ مضائقہ نہ تھا مگر اس کو کیا کیجیے کہ اس کے بندے جو اس کی مخلوق ہیں اور ان میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا دیا ہوا ہے، بڑے بڑے حکیم ہوتے ہیں، وہ (بندوں کا خالق) اگر حکیم نہ ہو تو پھر ان (مخلوق) میں حکمت آنے کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ عنقریب مضمون دل نشین ہوا چاہتا ہے۔

افعال ارادیہ غرض سے خالی نہیں ہوتے

مگر جب بات ٹھہری کہ پیدائش انسانی حکمت سے خالی نہیں تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ اس کو کسی کام کے لیے بنایا ہے۔ سو وہ خدا کے اور تو یہ کسی کے کام کا ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ ابھی واضح ہو چکا ہے ورنہ وہ خدا ہی کے کام کا ہوگا۔ ہاں اگر انسان کسی کا مخلوق نہ ہوتا تو البتہ یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ حکمت بمعنی غرض تو اسی چیز سے متعلق ہو سکتی ہے جو بنائی ہوئی ہوتی ہے، وہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شی کو اس مطلب کے لیے بنایا ہے، ورنہ جو کسی کی بنائی ہوئی نہ ہو، کسی کا ارادہ اس کے بنانے میں مصروف نہ ہوا ہو، کسی کی توجہ اس طرف نہ ہوئی ہو جیسے خود خداوند عالم، وہاں غرض اور مطلب کی گنجائش نہیں، گو سب کی مطلب برآری اور کارروائی اسی سے متعلق ہو مگر اس کو کیا کیجیے کہ بنی آدم کے مخلوق ہونے پر خود اسی کی ذات وصفات کی کیفیت بزبان حال گواہ ہے۔ چنانچہ عنقریب ان شاء اللہ یہ عقدہ کھلا چاہتا ہے۔

انسان کا اطاعت خداوندی سے محروم رہنا اس کی کم نصیبی ہے گو اس میں کتنے ہی کمالات ہوں

الحاصل مطلب اصلی اس کی پیدائش سے یہ ہے کہ یہ خدا کے کام آئے، اور کسی اور کام میں مشغول نہ ہو۔ ورنہ پھر یہ تو احتمال نہیں کہ مطلب اصلی سے اعلیٰ کام اس سے نکلے۔ ورنہ

وہی مطلب اصلی ہوتا۔ اس لیے اس وقت اس کی مثال ایسی ہو جائے گی جیسے فرض کیجئے کپڑا بنایا تھا پہننے کے لیے مگر پہننے کے عوض جلا کر روٹی پکا لیجئے، ظاہر ہے کہ یہ بات کپڑے کے حق میں از قسم کم نصیبی ہوگی۔ ایسے ہی انسان بھی اگر اس مطلب اصلی سے محروم رہے جو اصل غرض اس کی پیدائش سے تھی تو اس کی کم نصیبی میں کیا کلام ہوگا۔

انسان کی فرماں برداری سے انسان ہی کو فائدہ ہے نہ کہ حق تعالٰی کو

مگر یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالٰی کسی کا کسی بات میں محتاج نہیں۔ بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔ چنانچہ بدلائل یہ بھی انشاء اللہ تعالٰی ثابت ہوا چاہتا ہے۔ تو اس (انسان) کا کام بجز اطاعت وفرماں برداری اور بندگی نہ ہوگا۔ اور اس فرماں برداری کا نتیجہ بجز نفع بنی آدم اور کچھ نہ ہوگا۔ یعنی جیسے مریض کے حق میں اطاعت طبیب اور اس کی فرماں برداری اسی کے حق میں مفید ہے طبیب کے حق میں مفید نہیں۔ ایسے ہی خدا کی اطاعت بندہ کے حق میں اسی کی نسبت مفید ہوگی، خدا کی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہوگا کہ کسی کے حق میں مفید نہ ہو ورنہ پھر وہی بے ہودہ کاری کا الزام آئے گا۔ بہر حال بندہ اطاعت خدا کے لیے ہے اور اس اطاعت کا نفع اسی کو ہے۔ اس لیے اطاعت خود بندہ کے حق میں مطلب اصلی ہوگی۔

انسان کا خود کو پہچاننا اللہ تعالٰی کے پہچاننے پر موقوف ہے

علاوہ بریں عقل ہر چیز کی حقیقت کے پہچاننے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اور قدرت بشری وغیرہ کو اس لیے بنایا ہے کہ حسب ہدایت عقل کام کیا کرے۔ اور ظاہر ہے کہ سب میں اول

لائق شناخت وعلم خداوند عالم ہے۔ کیوں کہ سب حقائق اسی کی وجہ سے اسی طرح تاباں ہوئی ہیں، جیسے فرض کیجئے آفتاب سے دھوپ۔ چنانچہ انشاء اللہ تعالی واضح ہوا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دھوپ کی حقیقت اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ وہ ایک پرتو آفتاب ہے۔ مگر چونکہ سب میں اول اپنی ذات کا علم ہوتا ہے اور اپنی حقیقت اس کا پرتو ٹھہرا تو بے شک اپنا پہچاننا اور علم، اس (اللہ تعالی) کے پہچانے اور اس کے علم پر موقوف ہوگا۔

اطاعت خداوندی انسان کے لئے مقتضائے طبعی ہے

مگر خدا کی معرفت میں کم از کم یہ تو ضروری ہوگا کہ اس کو غنی اور بے پرواہ اور اپنے آپ کو اس کا محتاج سمجھے۔ مگر (جب) یہ بات ہوگی تو بالضرور اس کی اطاعت اور فرماں برداری ایک طبعی بات اور مقتضائے دلی ہوگا۔ اور سوا اس کے جو کام ایسا ہو کہ خدا کی اطاعت اس پر اسی طرح موقوف ہو جیسے روٹی کا پکنا مثلاً آگ، لکڑی، توے، کونڈے وغیرہ پر تو وہ طاعت ہی کے حساب میں شمار کیا جائے گا، اور مثل اشیاء مذکورہ جو کھانے کے حساب میں شمار کی جاتی ہیں اس کام کو طاعت خدا کے حساب سے خارج نہ کریں گے اور سوا اس کے اور جو کام ہوگا وہ سب اس کارخانہ سے علیحدہ سمجھا جائے گا، اور اس لیے بوجہ فوت مقصود مذکورہ وہ کام آدمی کے حق میں از قسم کم نصیبی اور بدبختی شمار کیا جاوے گا۔

گمراہی کے دو سبب ہیں، غلطی اور غلبہ خواہش

مگر اس بدبختی کا سبب کبھی غلطی ہوتی ہے اور کبھی غلبہ خواہش۔ تو میرے ذمے بوجہ خیر خواہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لازم ہے کہ غلطی والوں کو غلطی سے آگاہ کروں اور مغلوبان خواہش کو ان کا شریک مرض سمجھ کر فضائل آخرت سمجھاؤں اور ان سے خود اس

ترقیب کا امیدوار ہوں، مگر چونکہ غلط کار لوگ بمنزلہ اس مسافر کے ہیں جو شہر مطلوب کی سڑک کو بوجہ غلطی چھوڑ کر کسی اور رہ کو ہولے، اور مغلوبان خواہش ایسے ہیں جیسے فرض کیجئے شہر مطلوب کی سڑک پر جاتے ہیں پر بادِ مخالف قدم بدشواری اٹھانے دیتی ہے اس لیے غلطی والوں کے حال پر زیادہ افسوس چاہئے۔

گمراہوں کی ناکامی اور مغلوبان خواہش کی کامیابی کی توضیح بذریعہ مثال

کیونکہ جیسے اس مسافر کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں جو سڑک شہر مطلوب کو چھوڑ کر کسی اور سڑک کو ہولیا ہو، اگرچہ کیسا ہی تیز رفتار کیوں نہ ہو، ایسے ہی ان صاحبوں کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں جو بوجہ غلطی راہِ مستقیم خدا کو چھوڑ کر کسی اور راہ ہو لئے ہیں اگرچہ کیسے ہی عابد زاہد کیوں نہ ہوں۔ البتہ وہ لوگ جو اسی راہ کو جاتے ہیں جو خدا تک جاتا ہے پر ہوا و ہوس کے دھکے بدشواری چلنے دیتے ہیں وہ گو بدشواری پہنچیں پر ایک نہ ایک روز گرتے پڑتے، گرم سرد زمانہ چکھتے چکھاتے شہر مطلوب یعنی جنت میں پہنچ رہیں گے، گو اثناء راہ میں رنج اور عذاب کی تکالیف گوناگوں ان کو بھگتنی پڑیں اور ان کا حال ایسا حال ہو جیسا فرض کیجئے مسافر مذکور اس باد مخالف کے جھونکوں اور دھکوں کے باعث گر پڑ کر چوٹیں کھائے اور سلامت نہ جائے۔

نجات دین محمدی ہی میں منحصر ہے

اس لئے بہ نظر خیر خواہی یہ گزارش ہے کہ سوائے دین محمدی (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں عقائد کی غلطیاں باعث ترک رہگذر اصلی جس کو صراط مستقیم کہئے نہ ہوئی ہوں۔ تعصب مذہبی کو چھوڑ کر اگر اور صاحب غور فرمائیں گے تو سب کے سب

اسی دین کو اپنے مطلوب اصلی کا راستہ سمجھیں گے۔ ہاں جس کو فکر آخرت ہی نہ ہوگا اور اس جنت کی طلب ہی اس کے دل میں نہ ہوگی جو بمنزلہ شہر مطلوب منزل مقصود ہر عام و خاص ہے تو وہ صاحب بے شک بمقابلہ خیر خواہی کمترین اور الٹے درپے تردید حق ہوں گے اور خود اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں کاٹ لیں گے۔

خیر ہر چہ بادا باد، عاقل کو اہل عقل سے امید تسلیم حق ہی چاہئے۔ اس لئے یہ گزارش ہے کہ اس دین کے اصول نہایت پاکیزہ ہیں۔ دو باتوں پر اس مذہب کی بناء ہے۔ ایک توحید جو خلاصہ لا الہ الا اللہ ہے، دوسری رسالت جو خلاصہ محمد رسول اللہ ہے۔ سو ان کے اور جو کچھ ہے انہیں دو باتوں کی تفریع و تمہید ہے۔ اول رکن کی توضیح کرتا ہوں بعد ازاں رکن ثانی کو بیان کروں گا۔

☆......☆......☆

رکن اول: وجود باری تعالیٰ

اے حاضرین جلسہ! سنو اور غیر حاضروں کو سناؤ کہ ہمارا تمہارا وجود پائیدار نہیں، نہ ازل سے ہے نہ ابد تک رہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے اور پھر اسی طرح ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں ہمارا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ یہ وجود و ہستی کا زوال و انفصال باآواز بلند کہتا ہے کہ ہمارا وجود ہمارا خانہ زاد نہیں، مستعار ہے۔ یعنی مثل نور زمین و گرمی آب ہے۔ مثل نور آفتاب و حرارت آتش نہیں۔ مگر جیسے زمین کا نور اور آب گرم کی گرمی آفتاب اور آگ کا فیض اور اس کی عطا ہے ایسے ہی ہمارا وجود بھی کسی ایسے کا فیض و عطا ہوگا جس کا وجود خانہ زاد ہو، مستعار نہ ہو۔ جیسے آفتاب اور آگ پر نور اور گرمی کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یوں نہیں کہہ سکتے کہ عالم اسباب میں آفتاب اور آگ سے اوپر کوئی اور ہے جس کے فیض سے وہ منور اور یہ گرم ہے۔ ایسے ہی ہمارا وجود جس کا فیض ہوگا اس پر وجود کا قصہ ختم ہو جاوے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ اس کا وجود کسی اور کا فیض ہو۔ ہم اسی کو خدا اور اللہ اور مالک الملک کہتے ہیں۔

خدا کا وجود اس کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوتا

مگر جب اس کا وجود اسی کا ہے کسی اور کا دیا ہوا نہیں، تو بے شک اس کا وجود اس کے ساتھ اسی طرح لازم و ملزوم رہے گا۔ جیسے آفتاب کے ساتھ نور اور آگ کے ساتھ گرمی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ ہو اور گرمی نہ ہو، آفتاب ہو اور نور نہ ہو۔ ایسے ہی یہ بھی نہ ہوگا کہ خدا کی ذات ہو اور اس کا وجود نہ ہو۔ بلکہ یہ خیال ہی غلط ہوگا کہ خدا کی ذات ہو اور اس کا وجود نہ ہو۔

فہرست حجۃ الاسلام

اس لئے خدا کی ذات کا ہونا بے وجود متصور نہیں ہوتا۔ اس وجود اور موجودیت ہی کو تو خدا کہتے ہیں اور اس لئے اس کی ذات اور اس کے وجود میں ایسی نسبت ہوگی جیسے دو میں اور اس کی زوجیت یعنی جفت ہونے میں، جیسے زوجیت دو سے کسی حالت میں اور کسی وقت میں ذہن میں نہ خارج میں، جدا نہیں ہو سکتی ایسے ہی خدا کی ہستی اس کی ذات سے جدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جیسے عدد دو کی زوجیت ایسی نہیں جیسے اس کے معدود کی یعنی اس شے کی جس کو دو کہتے ہیں، ایسے ہی خدا کی ہستی اور اس کا وجود اصلی دائم اور قائم ہے، ممکن نہیں جو اس سے جدا ہو جاوے۔

رہا آفتاب کا کسوف اور آگ کا بجھ جانا یا آفتاب کا اور آگ کا معدوم ہو سکنا ہمارے دعوے کے مخالف نہیں۔ کیونکہ سورج گہن میں تو سورج کا نور ایسی طرح اوٹ میں آ جاتا ہے جیسے چراغ دیوار کی اوٹ میں سارا، یا آدھا، یا تہائی آ جائے۔ الغرض اس کا نور اس سے زائل نہیں ہوتا چھپ جاتا ہے۔ اور آگ چراغ کے بجھنے کے وقت اس کا نور اس سے جدا نہیں ہوتا بلکہ آگ معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کی گرمی اور نور بھی اسی کے ساتھ عدم میں چلی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جدائی اور بے وفائی نہیں بلکہ نہایت ہی درجہ کی معیت اور ساتھ ہے۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ یہ معیت اور ہمراہی وجود میں متصور نہیں کیونکہ وجود کسی چیز کے ساتھ اس کے عدم میں نہیں جا سکتا۔ یہ بات جب ہی متصور ہے کہ وجود اس سے الگ ہو جائے۔ اس لئے وہ خداوند عالم بایں وجہ کہ اس کا وجود اصلی ہے قابل زوال نہیں، اور سب کا وجود اس کا فیض، ازلی بھی ہوگا اور ابدی بھی ہوگا، نہ کبھی وہ معدوم تھا اور نہ کبھی معدوم ہوگا اور اسی سبب سے یہ بھی ماننا ضرور ہوگا کہ وہ خدا اپنی ہستی میں کسی کا محتاج نہیں۔ اور سب اپنی

ہستی میں اس کے محتاج ہیں۔ اس لئے اس کا جلال ازلی اور ابدی ہے اور سوا اس کے سب کی عاجزی اور بے چارگی اصلی اور ذاتی۔

اس تقریر سے تو فقط اتنی بات ثابت ہوئی کہ وجود ہمارا خانہ زاد نہیں، اس خدا کا پرتوہ (پرتو) ہے جو اپنے وجود میں مستقل ہے۔ پر اب اس کی وحدانیت کی بات بھی سننی چاہئے۔

اثباتِ وحدت

دیکھئے جیسے متعدد روشن دانوں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، پر نور ایک ہی سا ہوتا ہے اور پھر وہ شکلیں بذاتِ خود باہم بھی متمیز ہوتی ہیں اور اس نور سے بھی متمیز ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس وہ نور بھی بذاتِ خود ہر شکل سے ممتاز و متمیز ہوتا ہے۔ دوسرے جس چیز کو دیکھئے اس کی ایک حقیقت ہے کو وجود ایک ہی سا ہے اور پھر ہر حقیقت بذاتِ خود دوسری حقیقت سے بھی متمیز اور وجود مشترک سے بھی متمیز ہے۔ علیٰ ہذا القیاس وجود بھی بذاتِ خود ہر حقیقت سے ممتاز و متمیز ہے اور اس لئے جیسے روشن دانوں کی دھوپوں میں دو دو باتیں ہیں ایک نور ایک شکل۔ پر خود نور میں دو چیزیں نہیں۔ ایسے ہی مخلوقات میں تو دو دو چیزیں ہیں۔ ایک وجود اور ایک ان کی حقیقت۔ پر اس وجود میں دو چیزیں نہ ہوں گی اور اس لئے اس موجود اصلی میں جس کی نسبت وجود مذکور فیض ہے کیونکر دوئی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جیسے گرمی، گرم چیز اور غیر گرم چیز سے، سردی سرد چیز اور غیر سرد چیز سے نہیں نکل سکتی اور اس لئے گرمی اور سردی کے مخرجِ اصلی میں ایسی دوئی کی گنجائش نہیں جو مخالف وحدت گرمی و سردی ہو ایسے ہی وجود بھی موجود اصلی اور غیر موجود اصلی سے نہیں نکل سکتا۔ اور اس لئے اس کے مخرجِ یعنی اس موجود اصلی میں وجود کی وحدت کی مخالف کوئی دوئی نہ ہوگی۔

بساطة الوجود

اور ظاہر ہے کہ وجود میں کسی قسم کی ترکیب نہیں۔ کیونکہ جیسے مرکب کا انجام آخر کار ایسے اجزاء پر ہو جاتا ہے جن میں کچھ ترکیب نہ ہو۔ ایسی ہی ہر چیز کا اس وجود پر ہے۔ وجود سے آگے اور کوئی جز نہیں نکل سکتا۔ اس تقریر سے تو موجود اصلی یعنی خدا کی ذات میں وحدت ثابت ہوئی۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ خدا کی ذات میں ترکیب نہیں۔ اب اس وحدانیت کی بات بھی سنئے جس کا ماحصل یہ ہو کہ دوسرا اس کا ثانی بھی کوئی نہیں۔

اثبات وحدانیت

اے حاضران جلسہ! یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ہمارے اصل وجود میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں۔ یعنی جتنے دور میں کو ہم آتے ہیں اتنے دور میں اور کوئی نہیں سماتا۔ جب ہمارا وجود ضعیف اپنے احاطہ میں کسی کو سمانے نہیں دیتا اس موجود اصلی کا وجود قوی کیونکر اپنے احاطہ میں کسی دوسرے کو سمانے دے گا اور ظاہر ہے کہ وجود کے احاطہ کے برابر نہ انسانیت کا احاطہ ہے، نہ حیوانیت کا احاطہ ہے، نہ جسمیت کا احاطہ ہے، نہ جوہریت کا احاطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کو موجود کہتے ہیں اور سب موجودات کو انسان یا حیوان یا جسم یا جوہر نہیں کہہ سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ احاطہ وجود سب احاطوں میں وسیع ہے اور اس سے اوپر کوئی احاطہ نہیں یعنی ایسا کوئی مفہوم نہیں کہ وہ موجود اور غیر موجود کو شامل ہو اس لئے یہ بات ماننی لازم ہے کہ جیسے کشتی کے احاطہ میں کسی دوسری کشتی یا دوسری کشتی کی حرکت کی گنجائش نہیں۔ ایسے ہی موجود اصلی کے احاطہ میں جو بمقابلہ کشتی متحرک ہے اور فیض وجود عالمگیر کے احاطہ میں جو بمقابلہ حرکت کشتی ہے جو کشتی نشینوں کے حق میں اس کا فیض ہے کسی دوسرے موجود اصلی اور

نقیض وجود کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

وحدانیت کی دوسری دلیل

علاوہ بریں اگر دو یا زیادہ موجود اصلی ہوں گے تو وہ پھر دونوں آپس میں متمیز بھی ضرور ہوں گے۔ یعنی ان میں دوئی ہوگی۔ لیکن باوجود اس کے وجود ایک ہی ہوگا۔ کیونکہ دونوں کو موجود رکھنا خود اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ایک چیز ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مشترک نہ ہوتی تو ایک لفظ ایک معنی کی رو سے دونوں کے لئے بولنا صحیح نہ ہوتا۔

اس صورت میں وہ چیزیں جن کے سبب امتیاز باہمی ہے وہ کچھ اور ہوں گے اور یہ وجود کچھ اور شے ہوگا۔ الغرض تعدد ہوگا تو سامان امتیاز بھی ضرور ہوگا۔ مگر امتیاز بے اس کے متصور نہیں کہ ماوراء وجود مشترک دونوں میں اور کچھ بھی ہو۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ایک میں فقط وجود ہو۔ کیونکہ اول تو وجود صفت ہے۔ اور صفت کا تحقق بے تحقق موصوف ممکن نہیں۔ دوسرے اس صورت میں ایک طرف اگر فقط وجود ہوگا تو دوسری طرف اسی کا نقیض ہوگا۔ جس کے بطلان پر اتنی ہی بات کافی ہے کہ دونوں جا ایک ہی معنی اور مضمون ہے۔

شے واحد کی علت دو مختلف چیزیں نہیں ہو سکتیں

مگر اس صورت میں وہ دو چیزیں علت وجود مشترک نہ ہوں گی۔ کیونکہ معلول پرتو علت ہوتا ہے اور ایک شے واحد دو مختلف چیزوں کا پرتو نہیں ہو سکتی۔ الغرض دونوں چیزیں باہم بھی ممتاز ہوں گی اور وجود مشترک سے بھی ممتاز ہوں گی۔ اس لئے وجود اور شے میں جس کی اس وقت ایسی صورت ہو جائے گی جیسے زمین اور نور کی ہے کوئی رابطہ ذاتی نہ ہوگا جو مانع انفصال ہو۔ اس لئے ایک دوسرے سے جیسے متصل ہے ویسے ہی جدا بھی ہو سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت

میں وہ موجودیت اصلیہ خاک میں مل جائے گی اور اس سے اوپر اور کوئی موجود ماننا پڑے گا جس کا وجود اصلی ہوگا۔

احاطۂ وجود کے اندر اور باہر کوئی اُس کا ثانی نہیں

الغرض وجود ایک مضمون واحد ہے اس کا مخرج بھی واحد ہی ہوگا۔ پھر اس کے احاطہ وجود میں تو اس لئے اس کے ثانی کی گنجائش نہیں کہ یہ بات تو ہمارے احاطۂ وجود میں بھی ممکن نہیں۔ حالانکہ ہمارا وجود اس کے وجود سے ایسی طرح ضعیف ہے جیسے دھوپ آفتاب کی اس نور سے جو اس کی ذات میں ہے، اور اس سے باہر اس لئے کہ کسی دوسرے کا امکان نہیں۔ کیونکہ وجود کا احاطہ سب میں اوپر کا احاطہ ہے اس سے خارج اور کوئی احاطہ نہیں۔ پھر دوسرا ہو تو کہاں ہو۔

وجود ہر طرح سے غیر محدود اور غیر متناہی ہے

بلکہ فہم و انصاف ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وجود ہر طرح سے غیر محدود اور غیر متناہی ہے کیونکہ محدود اور متناہی ہونے کے تو یہی معنی ہیں کہ یہاں تک مثلاً ہے اور اس سے آگے نہیں اور یہ بات بجز اس کے متصور نہیں کہ اس حد کے آگے کوئی شے مانی جائے کہ اس میں یہ حد نہ ہو اور اس کے اوپر کوئی مطلق مانا جائے کہ اس میں یہ قید نہ ہو۔ مگر جس صورت میں موجود سے اوپر کوئی مطلق اور غیر محدود نہیں تو پھر وجود ہی کو ایسا مطلق اور غیر محدود کہنا پڑے گا جس کے اوپر کوئی مطلق اور غیر محدود نہیں جس سے یہ بات خواہ مخواہ لازم آجائے گی کہ وجود ہر طرح سے غیر متناہی اور غیر محدود اور منبع الوجود مطلق ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے کی اس کے آگے گنجائش ہی نہیں کیونکہ غیر متناہی کے آگے کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے قیاس وجود ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہوگا اور سوا اس کے اور سب کا وجود اس

کی عطا اور فیض ہوگا۔

خدا کے لئے باپ، بیٹا، بھائی نہیں ہو سکتا

مگر جب یہ بات مسلم ہوئی کہ وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے تو پھر نہ کوئی اس کا ماں باپ ہوگا، نہ کوئی اس کی اولاد، نہ کوئی اس کا بھائی برادر۔ کیوں کہ یہ باتیں جب ہی متصور ہوں کہ باوجود اتحاد نوعی تعدد متصور ہو۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا باپ اور خدا کا بیٹا اور خدا کا بھائی باوجود تعدد خدائی میں اسی طرح شریک ہوں گے۔ جیسے انسان کا باپ اور انسان کا بیٹا اور انسان کا بھائی باوجود تعدد وانسانیت میں شریک ہیں۔ لیکن ابھی اس بات سے فراغت ہوئی ہے کہ خدا کا تعدد محال ہے اس لئے خدا کے لئے بیٹے کا ہونا یا ماں باپ کا ہونا یا بھائی کا ہونا بھی بے شک من جملہ محالات ہوگا۔

خدا کو باپ یا انسان کو بیٹا اگر کہا گیا ہے تو مجاز ہے

البتہ ہو سکتا ہے کہ جیسے رعیت کے لوگ اپنے حاکموں اور بادشاہوں کو بوجہ مزید التفات ماں باپ کہہ دیا کرتے ہیں اور بادشاہ اور حاکم ان کو فرزندی کا خطاب دے دیا کرتے ہیں۔ ایسے ہی اگر گاہ وبیگاہ کسی بزرگ، نبی، ولی نے خدا تعالیٰ کو باپ کہہ دیا ہو یا خداوند تعالیٰ نے کسی اپنے اچھے بندے کو جیسے انبیاء اولیاء فرزند کہہ دیا تو اس کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ خدا تعالیٰ ان بزرگوں پر مہربان ہے۔ حقیقی ابوت یا بنوت اسی جا پر سمجھ لینا اور خدا تعالیٰ کو حقیقی باپ اور ان کو حقیقی بیٹا سمجھنا سخت بے جا ہوگا۔

جس لفظ کے استعمال میں کسی وقت غلط فہمی ہو

اُس کی ممانعت ضروری ہے

تمہیں خیال کرو کہ اگر کوئی شخص کسی حاکم سے اس کی رعیت کی نسبت لفظ فرزند سن کر یا رعیت سے بہ نسبت حاکم لفظ باپ سن کر باوجود ان قرائن کے جو حقیقی معنوں کی نفی کرتے ہیں حقیقی معنی سمجھ جائے اور اس وجہ سے رعیت کے آدمیوں کو وارث تاج وتخت اعتقاد کرکے اس کی تعظیم وتوقیر اس کے مناسب کرنے لگے تو یوں کہو کہ اس نے غلاموں کو میاں کے برابر کردیا اور اس وجہ سے بے شک مورد عتاب بادشاہ ہوجائے گا۔ ادھر اس طوفان بے تمیزی کا انجام یہ ہوگا کہ یہ شخص تو اپنی سزا کو پہنچے اور رعیت کا یہ خطاب بدلا جائے تاکہ پھر کوئی ایسی حرکت نہ کرے مگر حاکم اور رعیت میں تو بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ حاکم لباس معزز پہنے ہوئے تاج مرصع سر پر رکھے ہوئے، امراء وزراء اپنے اپنے قرینوں سے دست بستہ مؤدب کھڑے ہوئے تخت زیر قدم، ملک زیر قدم، اور بے چارے رعیت والے ذلیل وخوار نہ لباس درست، نہ صورت معقول، یا بازار خواری وزاری جوتیوں میں استادہ۔ اس قسم کے تفاوت خارجی ظاہر بینوں کے حق میں تفاوت مراتب سمجھنے کو کافی ہوتی ہیں۔ حالانکہ تمام اوصاف اصلی یعنی مقتضیات ذوی اور امکانی میں اشتراک موجود جس سے ایک بار وہم قرابت نسبی ہوجائے تو کچھ دور نہیں اور خدا میں اور بندہ میں خدائی تو درکنار کسی بات میں بھی اشتراک نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس پر بھی کسی بندہ کو بوجہ الفاظ مذکورہ خدا یا خدا کا بیٹا سمجھ لینا بڑی ہی فاش غلطی ہے اور بے شک یہ اعتقاد غلط اس کے حق میں باعث عذاب اور ان بزرگوں کے حق میں موجب سلب خطاب ہوگا۔

ابطالِ جنوت کی دلیل

علاوہ بریں خدائی اور حاجت مندی میں منافات ہے۔ خدا وہ ہے جس کا وجود خانہ زاد ہو اور ظاہر ہے کہ جب وجود خانہ زاد ہو تو پھر ساری خوبیاں موجود ہوں گی کیونکہ جس خوبی کو دیکھئے علم ہو یا قدرت، جلال ہو یا جمال اصل میں یہ سب باتیں وجود ہی کے تابع ہیں۔ اگر کوئی شے موجود نہ ہو تو پھر اس میں علم و قدرت وغیرہ اوصاف بھی نہیں آ سکتے۔ یہ کب ممکن ہے کہ زید مثلاً موجود نہ ہو اور عالم ہو جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں وجود کے اوصاف ہیں۔ اگر اس کے اوصاف نہیں تو بے شک ان اوصاف کا اپنے موصوف میں قبل وجود موصوف ہونا ممکن ہوتا۔ اس لئے یہ بات واجب التسلیم ہی ہے کہ خدا میں سب خوبیاں پوری پوری ہیں اور کسی قسم کی حاجت نہیں کیونکہ حاجت اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی کی چاہتی چیز نہ ہو مگر سوائے خوبی اور کیا چیز ہے جس کو جی چاہے۔

ذات خداوندی تمام عیوب سے منزہ اور تمام کمالات کی جامع ہے

اس تقریر سے جیسا یہ معلوم ہوا کہ خداوند عالم کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں ایسے ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں کوئی عیب نہیں۔ کیونکہ عیب سوا اس کے اور کیا ہے کہ اس میں کوئی خوبی نہ ہو اور نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سوائے خدا تمام موجودات ہر بات میں خدا کے محتاج ہیں۔ کیونکہ جب وجود میں خدا کے محتاج ہوئے تو اور خوبیوں میں بدرجۂ اولیٰ محتاج ہوں گے۔ اس لئے سوائے وجود جو کوئی خوبی کی بات ہے وہ اصل میں وجود ہی صفت ہے۔

جملہ جمادات و نباتات علم و فہم و حس و حرکت سے خالی نہیں

اور اس لئے اس بات کا بھی اقرار کرنا ضرور ہوگا کہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ علم و فہم، حس و

حرکت کی قوت ہے۔ کیونکہ جب علم وغیرہ اوصاف اصل میں وجود کے اوصاف ٹھہرے تو پھر جہاں جہاں وجود ہوگا وہاں وہاں یہ اوصاف بھی ضرور ہوں گے۔ اس لئے کہ اوصاف اصلیہ جدا نہیں ہو سکتے چنانچہ ظاہر ہے۔ البتہ یہ بات مسلم کہ جیسے آئینہ اور پتھر بوجہ تفاوت قابلیت آفتاب سے برابر فیض نہیں لے سکتے۔ گو اس کی طرف سے برابر فیض نور رواں ہو، ایسے ہی بوجہ تفاوت قابلیت انسان کے برابر کوئی چیز قابل اعلم نہیں ہو سکتی۔

انسان سراپا احتیاج ہے

مگر جیسے قابلیت کمال اس میں سب سے زیادہ ہے، ایسے ہی احتیاج بھی اس میں سب سے زیادہ۔ دیکھ لیجئے زمین کو تو بظاہر سوائے خدا اور کسی کی حاجت ہی نہیں، پر نباتات کو زمین، پانی، ہوا، دھوپ سب کی ضرورت۔ اور پھر حیوانات کو علاوہ حاجت مشارالیہ کھانے پینے اور سانس لینے کی بھی ضرورت ہے۔ اور انسان میں سوائے حاجات مذکورہ لباس، گھوڑا، ٹٹو (چھوٹے قد کا گھوڑا)، مکان، عزت آبرو وغیرہ کی بھی ضرورت۔ کھیتی باڑی، گائے، بھینس، اونٹ، سونا، چاندی، تانبا، روپیہ وغیرہ اس قدر اشیاء کی حاجت ہے جس سے اس کا سراپا حاجت ہونا نمایاں ہے۔ اس لئے یہ کس قدر سخت گمراہی اور غلطی ہے کہ کسی آدمی کو خدا سمجھ لیجئے۔

سراپا احتیاج انسان خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہو سکتا

اور ان حاجات کو بھی جانے دیجئے۔ بول و براز تھوک بلغم میل کچیل وغیرہ آلائشوں کو دیکھئے تو پھر خدائی کی تجویز انہیں کا کام ہے جس کو خدا سے کچھ مطلب نہیں۔ افسوس صد افسوس اپنے گھر اگر بندر یا سور کی شکل کا لڑکا پیدا ہو جائے تو کس قدر رنجیدہ ہوں کہ الٰہی پناہ۔ حالانکہ

بندر اور سور اور آدمی اور بھی کچھ نہیں تو مخلوق ہونے اور کھانے پینے اور بول و براز میں تو شریک ہیں۔ اور خدا کے لئے ایسی اولاد تجویز کریں جس کو کچھ مناسبت ہی نہ ہو۔ تمہیں فرماؤ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو، بول و براز سے مجبور ہو اس میں اور خدا میں کونسی بات کا اشتراک ہے جو خدا کا بیٹا یا خدا کہتے ہو۔ توبہ کرو اور خدا کے غضب سے ڈرو۔ ایسے محتاج ہو کر ایسے غنی مستغنی کی اتنی بڑی گستاخی۔

مسیح علیہ السلام کا خدا یا خدا کا بیٹا ہونا بدیہی البطلان ہے

جن کو تم خدا یا خدا کا بیٹا سمجھتے ہو اُن میں آثار عبودیت ہم سے بھی زیادہ تھے۔ علاوہ ان عیوب کے جن کو عرض کر چکا ہوں اُن کا زہد و تقویٰ اور خشیت اور طاعت وعبادت جس میں شب و روز وہ لوگ غلطاں و پیچاں رہتے تھے۔ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان میں خدائی کی بو بھی نہ تھی۔ فرعون نے خدائی کا بہروپ اور سانگ تو بنا رکھا تھا وہاں تو یہ بھی نہ تھا۔ جس وقت فرعون کے خدا کہنے والے مستوجب عتاب ہوئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کہنے والے کیونکر مستحق عذاب نہ ہوں گے، یہاں تو ہر پہلو سے بندگی ہی ٹپکتی تھی۔ اقرار تھا تو بندگی کا تھا اور کار تھا تو بندگی کا تھا۔ اگر وہ اپنے بندہ ہونے کو چھپاتے اور دعویٰ خدائی کرتے، عبادت زہد و تقویٰ سے کچھ مطلب نہ رکھتے تو خیر کسی عاقل یا جاہل کو بوجہ معجزات ان کی طرف گمان خدائی ہو جاتا تو ہو جاتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ عقل و دانش سب موجود وہاں بجز آثار بندگی اور کوئی چیز نہیں۔ تس (اس) پر ان کو خدا کہے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ یہ کس شراب کا نشہ ہے جس نے عقل و دانش سب کو بے کار کر دیا۔ کیا عقل و دانش اس مصابیح قلیل دنیا ہی کے لئے خدا نے عطا فرمائی تھی ہرگز نہیں یہ چراغ بے دود، راہ دین کے نشیب و فراز کے دریافت کرنے

کیلئے تھا۔

اب بھی کچھ نہیں گیا باز آ جاؤ توبہ کرو اور ایسی گستاخیاں کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔

ابطال عقیدہ تثلیث

حق (اس) پر یہ کیا ستم ہے کہ اس ایک خدا کو ایک بھی حقیقت کی رو سے کہتے ہو اور تین بھی حقیقت ہی کی رو سے کہتے ہو اور باز نہیں آتے۔ اے حضرات عیسائی! درد مندی توی کے باعث یہ کمترین خستہ حال ملتمس خراش ہے کہ اصول دین میں ایسی محال باتوں کا ہونا بے شک اہل عقل کے نزدیک بطلان مذہب کے لئے کافی ہے۔

عقیدہ کے لئے مطابقت واقع ضرور ہے

اور عقائد کی غلطی کو مذہب کا غلط ہونا لازم

صاحبو! عقیدہ ایک قسم کی خبر ہوتی ہے جس کے صحیح و صادق ہونے پر مذہب کا صحیح و صادق ہونا اور اس کے غلط اور جھوٹ ہونے پر مذہب کا غلط اور جھوٹ ہونا موقوف ہوتا ہے۔ کیونکہ اور باقی کارخانہ یعنی بندگی و عبادت اسی خبر اور اعتقاد کے باعث ہوتا ہے۔ مگر تمہیں کہو ایک شے کی حقیقت میں تین ہونے کو کس کی عقل صحیح و صادق کہہ دے گی۔ یہ ایسی غلطی عظیم الشان ہے جس کو لڑکوں سے لے کر بوڑھوں تک بے بتلائے سمجھ جاتے ہیں۔ تثلیث اور توحید کے اجتماع کے محال ہونے پر تو عقل ایسی طرح شاہد ہے جیسے آنکھ آفتاب کے نورانی ہونے پر یعنی جیسے بے واسطہ غیر ہر کسی کو اپنی آنکھ سے آفتاب کا نورانی ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتماع مذکور کا محال ہونا بے واسطہ دلیل عقل کے نزدیک واضح اور روشن ہے۔ اور ادھر اجتماع مذکور کے ثبوت پر نہ عقل بے واسطہ شاہد ہے نہ بواسطہ کوئی قوی دلیل عقلی ہے نہ ضعیف جس

سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ تثلیث اور توحید دونوں سچ ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی انجیل کا فقرہ اس مضمون پر دلالت بھی کرے تو اس فقرہ ہی کو غلط کہیں گے اور شہادت عقل کو غلط نہ کہیں گے۔

بداہت عقل کے مقابلہ میں کوئی دلیل عقلی نظری معتبر نہیں ہو سکتی

الغرض دلیل نقلی ہو یا عقلی اس سے جو مطلب ثابت ہوگا وہ بمنزلہ شنیدہ ہوگا اور جو بات بے واسطہ دلیل خود معلوم ہوگی وہ بمنزلہ دیدہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اگر کوئی شخص فرض کرو کہیں اونچے پر کھڑا ہوا آفتاب کو چشم خود دیکھے کہ کس قدر افق سے اونچا ہے اور ایک شخص دیوار کے پیچھے بیٹھا ہوا بوسیلہ گھڑی یہ کہے کہ آفتاب غروب ہو چکا تو وہ شخص جو اپنی آنکھ سے آفتاب کو دیکھ رہا ہے بالیقین یہی سمجھے گا کہ یہ گھڑی غلط ہے۔ الغرض جیسے گھڑی اوقات شناسی کے لئے بنائی گئی ہے مگر بمقابلہ چشم بینا اس کا اعتبار نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ گھڑی میں غلطی ممکن ہے ایسے ہی انجیل بھی ہدایت کیلئے اتاری گئی ہے مگر بمقابلہ عقل مصفا اس کا اعتبار نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نقل کتاب میں غلطی ممکن ہے۔ البتہ جیسے آنکھ بشرطیکہ صاف ہو اپنے ادراک میں غلطی نہیں کرتی اور اس کا ادراک یہی ہے کہ مبصرات کو بے واسطہ غیر دریافت کرے نوبت سماعت کی نہ آئے ایسے ہی عقل مصفا بھی اپنے ادراک میں غلطی نہیں کرتی۔ مگر اس کا ادراک یہی ہے کہ معقولات کو بے واسطہ دلائل سمجھے نوبت استدلال نہ آئے۔

اقرار علماء مسیحین کہ مضمون تثلیث الحاقی ہے

پھر طرفہ یہ ہے کہ وہ فقرہ جو اس قسم کے مضامین پر دلالت کرتا ہے خود مسیحیوں کے نزدیک

اُن کے علماء کے اقرار کے موافق من جملہ ملحقات ہے۔ چنانچہ نسخہ بائبل مطبوعہ مرزاپور 1870ء میں اس فقرہ کے حاشیہ پر مترجمان مطبع نے جو بڑے بڑے پادری تھے چھاپ بھی دیا ہے کہ یہ فقرہ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پایا جاتا۔ مگر تس (اس) پر بھی وہی تعصب اور وہی عقیدہ ہے۔

سچے عیسائی ہم محمدی ہیں

اے حضرات مسیحی! ہمارا کام فقط عرض معروض ہے، سمجھانے کی بات سمجھ لینا تمہارا کام ہے۔ خدا سے التجا کرو کہ حق کو حق کر دکھلائے اور باطل کو باطل کر دکھلائے۔ بزراہ مانو تو حق یہ ہے کہ سچے عیسائی ہم ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و افعال کے موافق اُن کو بندہ کہتے ہیں، اور خدا اور خدا کا بیٹا نہیں کہتے۔ خدا کو ایک کہتے ہیں، تین نہیں کہتے۔

حق تعالیٰ کے افعال اختیاری ہیں، اضطراری نہیں

اس کے بعد یہ گزارش کہ وہ خداوند عالم جس کا جلال ازلی اور ابدی ہے تمام عالم کا بنانے والا اور سب کام کرنے چلانے والا ہے۔ مگر اس کے افعال اس کے اختیاری ہیں، ایسے نہیں جیسے ڈھیلے پتھر کو کہیں پھینک دیجئے تو چلا جائے نہیں تو نہیں۔ اگر بالفرض ایسا ہو تو یوں کہو وہ اپنی حرکت و سکون میں اوروں کا محتاج ہو جائے۔ اور اس کے محتاج نہ رہیں۔ مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ بعد تسلیم اس بات کے کہ جو کچھ مخلوقات میں علم و قدرت ہے وہ سب خدا کے فیض سے ہے، خدا تعالیٰ کا اوروں کی نسبت مجبور کرنا ایسا ہوگا جیسا کہ یوں کہئے اصل میں کشتی میں بیٹھنے والے متحرک ہیں اور کشتی کی حرکت ان کا فیض ہے، یا آب گرم آگ سی گرم ہے پر گرمی آتش آب کا فیض ہے الغرض یہ نہیں ہو سکتا کہ خداوند عالم باوجود یکتائی اور خالقیت زور و قدرت

میں کسی کے سامنے مجبور ہو۔ سوائے اس کے اگر ہے تو یہی خلق و عالم ہے۔ پھر انہیں (خلق و عالم) سے خالق مجبور ہونے لگے تو الٹے بانس پہاڑ کو جانے لگیں اس لئے یہ بات بالضرور جانی لازم ہے کہ اس نے اپنے ارادہ سے سب کچھ کیا ہے اور اپنے ارادہ سے سب کچھ کرتا ہے۔ کیونکہ افعال کی یہی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری اور ایک اضطراری جو کسی اور کے جبر کے باعث سرزد ہوں۔

افعال خداوندی میں مثل صفات خداوندی ضرورت اور وجوب کا احتمال ہی نہیں

مثل صفات، ضرورت اور وجوب کا احتمال ہی نہیں۔ ورنہ حاصل افعال قدیم ہو جائے اور سب جانتے ہیں کہ حاصل افعال خداوندی یہی مخلوقات ہیں یا واقعات جو ایک دوسرے کے بعد ہوتے رہتے ہیں۔ سو اگر افعال قدیم ہوں تو یہ معلولات بھی قدیم ہو جاویں۔

افعال کے اختیاری ہونے کی دوسری دلیل

علاوہ بریں افعال ایک قسم کی حرکت ہوتی ہے اور حرکت میں ہر دم تجدد اور حدوث رہتا ہے اس میں قدم کا احتمال ہی نہیں جو واجب ہونے کا وہم آئے اور جب واجب نہیں تو پھر یہی دو صورتیں ہیں۔

ثبوت تقدیر

یا اختیاری ہوں گے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ ارادہ کے کاموں میں ارادہ سے پہلے اس کام کو سمجھ لیتے ہیں۔ مکان اگر بناتے ہیں تو اس کا نقشہ بنا لیتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں تو اس کا

تخمینہ کر لیتے ہیں۔ کپڑا اچھے ہیں تو قطع کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ خداوند عالم نے جو کچھ بنایا یا بنائے گا اس کا نقش اور اس کا تخمینہ اور اس کا کینڈا بالضرور اس کے پاس ہوگا ورنہ لازم آئے گا کہ اس کے کاروبار مثل حرکات وسکنات حجر وشجر ہوں "نعوذ باللہ" اس صورت میں بعض اسباب کا بعض کاموں میں دخیل ہونا ایسا ہوگا جیسا باوجود تیاری نقشہ مکان معمار اور مزدور وغیرہ کا اس مکان کی تیاری میں دخیل ہونا یا جیسے کھانے پکانے میں باوجود تخمین مقدار و کیفیت لذات آگ وغیرہ اشیاء کا دخیل ہونا۔ بلکہ غور کیجئے تو جو جو اشیاء کسی کام میں دخیل معلوم ہوتی ہیں سارے عالم کی نسبت وہ بھی من جملہ اجزاء نقشہ عالم ہوں گی۔ اگرچہ بہ نسبت نقشہ قدر مقصود خارج ہو۔ اسی کو اہل اسلام تقدیر کہتے ہیں۔ لغت عرب میں تقدیر بمعنی اندازہ ہے اور اس وقت وجہ تسمیہ ظاہر ہے اس صورت میں بھلائی برائی جنت و دوزخ اگر ہوں اور پھر جنت میں بھلوں کا جانا اور دوزخ میں بروں کا جانا ایسا ہوگا جیسا مکان کا دالان اور پاخانہ اور راحت وآرام کے لئے یہاں آنا اور پاخانہ پیشاب کے لئے وہاں جانا جیسے یہاں اگر پاخانہ کی زبان ہو اور وہ شکایت کرے کہ میرا قصور جو ہر روز مجھ میں پاخانہ ڈالا جاتا ہے اور دالان نے کیا انعام کا کام کیا ہے جو اس میں یہ فرش وفروش شیشہ آلات وجھاڑ فانوس وعطر خوشبو ہے تو اس کا یہی جواب ہوگا کہ تو اسی کے لائق ہے اور تجھ کو اسی کے لئے بنایا ہے اور وہ اسی کے قابل ہے اور اس کو اسی کے لئے بنایا ہے۔ علی ہذا القیاس ناپاکی مثل پاخانہ و پیشاب اگر یہ شکایت کریں کہ ہم نے کیا قصور کیا کہ جو پاخانہ ہی میں ڈالے جاتے ہیں۔ کبھی دالان نصیب نہیں ہوتا اور عطر خوشبو وغیرہ نے کیا انعام کا کام کیا ہے جو ہمیشہ دالان میں رہتے ہیں اور کبھی پاخانہ میں ان کو نہیں بھیجا جاتا تو اس کا جواب بھی یہی ہوگا۔ ایسے ہی اگر دوزخ اس کی

شکایت کرے کہ میں نے کیا قصور کیا ہے اور جنت نے کیا انعام کا کام کیا۔ یا بُرائی یہ شکایت کرے کہ میں نے کیا قصور کیا ہے جو میرے لئے سوائے دوزخ اور بُرے لوگوں کے اور کچھ نہیں۔ اور بھلائی نے کیا انعام کا کام کیا جو ہمیشہ اچھے آدمی اور جنت ہی اس کے لئے ہے۔ یا بُرے آدمی یہ شکایت کریں کہ ہم اگر بُرے ہیں تو تقدیر کی بُرائی ہے ہمارا کیا قصور۔ اور اچھے آدمی اگر اچھے ہیں تو تقدیر کی بھلائی ہے ان کا کیا زور۔ تو یہاں بھی یہی جواب ہوگا کہ تم اسی لائق ہو اور تمہیں اسی لئے بنایا ہے اور وہ اسی قابل ہیں اور ان کو اسی کے لئے بنایا ہے۔ الغرض اگر بنی آدم اپنے وجود اور کمالات وجود کو مثل علم ارادہ قدرت وغیرہ خدا کی طرف سے مستعار سمجھتا ہے جیسا ہم نے بعید اہم سمجھا دیا ہے تب تو یہ جواب ہے کہ ادھر ہم مالک اور ہم کو اختیار ادھر تم کو اس لئے بنایا اور تم اسی قابل جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بندہ سر رضا و تسلیم خم کرے اور چون و چرا بالکل نہ کرے۔

افعال خداوندی کے اضطراری ہونے کا ابطال

یا اضطراری مگر اضطراری ہونے کا بطلان تو یاں بھی ظاہر ہو گیا کہ اضطرار اسی مجبوری کو کہتے ہیں۔ سو خدا تعالیٰ اگر مجبور ہوگا تو سوائے عالم اور کون ہے اگر ہوگا تو عالم ہی میں کسی کا مجبور ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بات ظاہر البطلان ہے کہ اختیار و قدرت مخلوقات ہو تو خدا کا دیا ہوا، اور پھر خدا ہی ان کے سامنے مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے اس صورت میں اور الٹا خدا تعالیٰ کو مخلوقات سے مستفید کہنا پڑے گا کیونکہ جب خدا تعالیٰ مخلوقات کے سامنے مجبور ہوگا تو یہ معنی ہوں گے کہ اس کے افعال مخلوقات کی قدرت سے اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے کشتی میں بیٹھنے والوں کا پار ہو جانا کشتی کے پار ہو جانے کی بدولت ہوتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس صورت

ہیں جیسے کشتی نشین حرکت میں خود کشتی سے مستفید ہوتے ہیں ایسے ہی اس وقت خدا تعالی بندوں سے مستفید ہوگا۔ حالانکہ خوب طرح یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اختیار و قدرت وغیرہ صفاتِ کمال میں بندہ خدا تعالی سے مستفید ہے۔

عالم اپنے تمام اجزاء کے ساتھ حادث ہے

اس تقریر سے یہ بات بھی اہل عقل کو معلوم ہوگئی ہوگی کہ عالم سارا حادث ہے۔ اس میں سے ایک چیز بھی قدیم نہیں۔ اگر ایک چیز بھی قدیم ہوگی تو اس چیز کی نسبت یہ کہنا پڑے گا کہ یہ چیز مخلوق نہیں اور جب مخلوق نہ ہوگی تو دوسرا خدا اور نکلے گا جس کے ابطال کے لئے بعد ملاحظہ تقریرات گذشتہ اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ وجہ اس بات کی (کہ) کوئی چیز قدیم ہوگی تو پھر مخلوق نہ ہوگی یہ ہے کہ خلق یعنی پیدا کرنا ایک فعل ہے بلکہ سب میں پہلا فعل ہے اور خدا کے افعال سب اختیاری ہیں اور اگر خدانخواستہ اختیاری نہ ہوں اضطراری ہوں تب بھی ایک اختیار ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اضطرار کے تو معنی یہی ہیں کہ کسی صاحب اختیار کے سامنے مجبور ہو جائے غرض ہر فعل میں اپنا یا کسی بیگانے کا اختیار ماننا پڑے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ایجاد کا اختیار انہیں چیزوں میں متصور ہے جو اپنے وجود سے پہلے معدوم ہوں کیونکہ اختیار ایجاد اس کا نام ہے کہ معدومات کو چاہے موجود کردے۔ سو اگر موجودات عالم کو خدا تعالی کا مخلوق کہیں گے اور خدا تعالی کو ان کے پیدا کرنے میں صاحب اختیار سمجھیں گے تو بالضرور ہر شے کے وجود سے پہلے اس کو معدوم کہنا پڑے گا۔

افعال عباد کا خالق حق تعالی ہے

لیکن جب یہ بات مسلم ہوچکی تو اب اور سنئے کہ جب وجود کمالات، وجود عالم سب خداوند

عالم کی طرف سے مستعار ہوئے تو دو باتیں واجب التسلیم ہوئیں اول تو یہ کہ مخلوقات کے فعل اختیاری خداوند عالم کے اختیار سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جیسے آئینہ کے نور سے در صورتے کہ عکس آفتاب و ماہتاب و نور آفتاب و ماہتاب اس میں آیا ہوا ہو ایسے ہی در صورتے کہ زور و قدرت مخلوقات خدا کے زور و قدرت سے مستعار ہوئے تو جو کام ان کے اختیار و قدرت سے ہوگا وہ خدا ہی کے اختیار و قدرت سے ہوگا۔ کیونکہ ان کا اختیار و قدرت خدا ہی کے اختیار و قدرت سے مستعار ہے۔

تمام مخلوقات کے نفع و ضرر کا مالک حق تعالی ہے

دوسرے یہ بات بھی ماننی لازم ہوگی کہ عالم کا نفع و ضرر سب خداوند عالم کے ہاتھ ہے وجہ اس کی مطلوب ہے تو سنئے۔ دھوپ جس قدر آفتاب کے قبضہ و قدرت میں ہے اس قدر زمین کے قبضہ و قدرت میں نہیں اگرچہ زمین سے متصل اور آفتاب سے منفصل ہے زمین اس قدر نزدیک کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا اور آفتاب سے اس قدر دور کہ لاکھوں کوس کہئے تو بجا ہے۔ مگر جب آفتاب آتا ہے تو دھوپ آتی ہے اور جاتا ہے تو ساتھ جاتی ہے۔ پر زمین سے یہ نہیں ہوسکتا کہ دھوپ چھین کر رکھ لے آفتاب کو کیا جانے دے۔ وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ نور زمین نور آفتاب سے مستعار ہے۔ مگر یہ ہے تو وجود مخلوقات اور کمالات مخلوقات بھی خدا کے وجود اور کمالات سے مستعار ہیں۔ اس لئے ایسے ہی خداوند عالم اور وجود مخلوقات کو بھی سمجھئے وجود مخلوقات کو مخلوقات سے متصل اور خدا اس سے وراء الوراء۔ مگر پھر بھی جس قدر اختیار اور قبضہ خدا کا اس وجود پر ہے اس قدر مخلوقات کا قبضہ اس پر نہیں۔ ان آثار سے ظاہر ہے کہ وجود مخلوقات ملک مخلوقات نہیں۔ ملک خالق کائنات ہے۔ کیونکہ لباس مستعار

مستعیر کے بدن سے متصل ہوتا ہے مگر بوجہ اختیار رد و ستد معیر کی ملک سمجھا جاتا ہے گو اس کے بدن سے متصل نہیں ایسے ہی بوجہ اختیار رد و ستد وجود کائنات کو ملک خدا سمجھئے اس کا دینا لینا جس کو عطا و سلب اور نفع و ضرر بھی کہتے ہیں۔ دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

محبوبیت اصلی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے

ادھر علاوہ نفع و ضرر بایں وجہ کہ ساری خوبیاں اس کے لئے مسلم ہو چکیں اور سوائے اس کے جس کسی میں کوئی بھلائی ہے تو اس کا پرتو ہے یہ بھی تسلیم کرنا ضرور ہوگا کہ محبوبیت اصل میں اسی کے لئے ہے سوا اس کے جو کوئی محبوب ہے اس پر اسی کا پرتو ہے۔

حق تعالیٰ کے سوا قابل عبادت و اطاعت اور کوئی نہیں ہو سکتا

یہ بات جب ذہن نشین ہو چکی تو اور سنئے کہ مدار کار اطاعت فقط انہیں تین باتوں پر ہے یا امید نفع و راحت پر، یا اندیشہ نقصان و تکلیف پر، یا محبوبیت پر۔ نوکر اپنے آقا کی اطاعت نوکری کی امید پر کرتا ہے اور رعیت اپنے حاکم کی اطاعت اندیشہ اور خوف تکلیف سے کرتی ہے اور عاشق اپنے محبوب کی اطاعت بتقاضائے محبت اس کی محبوبیت کے باعث کرتا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں اصل میں خدا ہی کے لئے ہوئیں۔ تو ہر قسم کی اطاعت بھی اسی کے لئے ہونی چاہئے اور کسی کو اس کا شریک کیجئے تو پھر ایسا قصہ ہے کہ نوکر تو کسی کا ہو اور خدمت کسی کی کرے، رعیت کسی کی ہو اور حاکم کسی کو سمجھے معشوق کوئی ہو اور یاد کسی کو کرے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے نوکر لائق ضبطی تنخواہ اور ایسی رعیت قابل سزائے بغاوت اور ایسے عاشق دھکے دینے کے لائق ہوتے ہیں۔ انعام و اکرام تو درکنار پھر اس پر اگر وہ غیر جس کی اطاعت میں نوکر سرگرم ہو اور اس وجہ سے آقا کی خدمت چھوڑ بیٹھے خود اس کے آقا کا غلام ہو اور وہ شخص جس کو

رعیت کا آدمی اپنا حاکم سمجھتا ہے خود اس کی بادشاہی کا ماتحت ہو اور وہ شخص جو معشوق کو چھوڑ کر
جس کو یاد کرتا ہے وہ خود اس کے معشوق سے ایسی نسبت رکھتا ہو جیسے آفتاب سے اس کا وہ
عکس جو کسی خراب سے آئینہ میں ہوتا ہے تو ایسی صورت میں وہ عتاب اول اور بھی بڑھ جاتا
ہے کیونکہ اس صورت میں احتمال ہمسری و دریاوگی غیر ہو ہی نہیں سکتا جو اس دغا کے لئے کوئی
بہانہ ہو۔

انبیاء و علماء کی اطاعت عین اطاعت خداوندی ہے

بالجملہ اطاعت بجز خداوند عالم اور کسی کی جائز نہیں۔ ہاں جیسے حکام ماتحت کی اطاعت
بشرطیکہ وہ اپنے بادشاہ کے ماتحت ہو کر حکمرانی کریں آثار بغاوت نمایاں نہ ہوں عین بادشاہ
ہی کی اطاعت ہے اس لئے کہ حکام ماتحت کے احکام بادشاہی کے احکام ہوتے ہیں۔ ایسے
ہی انبیاء علیہم السلام اور علماء کی اطاعت بشرطیکہ علماء بمقتضائے منصب نیابت حکمرانی کریں۔
وہ عین خدا ہی کے احکام ہیں۔

انبیاء اور علماء کی اطاعت سے اُن کی عبادت لازم نہیں آتی

اس تقریر کے بعد یہ گذارش ہے کہ اطاعت یعنی فرماں برداری بشرطیکہ اپنے حاکم اور
فرماں روا کو نفع و ضرر کا مالک حقیقی اور محاسن اور محامد کا منبع حقیقی سمجھے عبادت اور بندگی ہے۔ اور
جو یہ بات نہ ہو یعنی اس کو مالک نفع و ضرر بطور مذکور اور منبع محاسن و محامد بطرز مشار الیہ نہ سمجھے تو
عبادت نہیں۔ کیونکہ پھر وہ اطاعت حقیقت میں اس کی نہیں ہوتی جس کی اطاعت کرتا ہے۔
آخر اگر کوئی حاکم معزول ہو جائے تو پھر اس کی اطاعت کون کرتا ہے۔ علی ہذا القیاس اگر محاسن
و محامد کسی شخص میں نہ رہیں تو پھر اس کا عاشق اور خریدار کون بنتا ہے اور ظاہر ہے کہ خداوند عالم

سے یہ باتیں اوروں کی طرح نہیں جدا ہو سکتیں جو یوں کہا جائے کہ جس میں ملکیت نفع و ضرر اصلی ہیں وہی معبود ہے خدا نہیں اور جس میں یہ محاسن اصلی ہیں وہی محبوب ہے خدا نہیں۔

کسی کو مالک نفع و ضرر اور منبع محاسن سمجھنا عبادت ہے

مگر چونکہ طاعت مطیع کی ذلت اور مطاع کی عزت کو مقتضی ہے تو وہ اعزاز جس میں کسی کو بذات خود مستحق سمجھ لیا جائے اس کو مالک نفع و ضرر اور منبع محاسن سمجھا جائے اگرچہ از قسم اطاعت یعنی امتثال امر و نہی نہ ہو وہ بھی من جملہ عبادت ہوگا۔

جو اعمال مظہر عبادت ہوں وہ بھی عبادت سمجھے جائیں گے

نیت عبادت ہو یا نہ ہو

علیٰ ہذا القیاس اس اعتقاد کے ساتھ خدا تعالیٰ ہمارے نفع و ضرر کا مالک و مختار ہے اور تمام محاسن کی اصل اور منبع ہے اور جو نسے اعمال کو ایسی نسبت ہو جیسے ہماری روح کے ساتھ ہمارے بدن کو اور اس کے قوائے مختلفہ کو جیسے قوت باصرہ اور قوت سامعہ مثلاً بدن کے اعضائے مختلفہ یعنی آنکھ، کان کے ساتھ مثلاً تو وہ اعمال بھی من جملہ عبادات شمار کیے جائیں گے۔ ہاں اتنا فرق ہوگا جتنا روح اور بدن اور قوت باصرہ اور آنکھ میں فرق ہے۔ یعنی جیسے روح ہماری اصلی حقیقت ہے اور عالم اجسام میں بدن اس کا قائم مقام، قوت باصرہ ابصار میں اصل ہے اور آنکھ عالم اجسام میں اس کا خلیفہ، ایسے ہی اصل عبادت وہ اعتقاد ولی ہوگا اور وہ اعمال عالم اعمال میں اس کے خلیفہ۔ سو جیسے قوت باصرہ کا خلیفہ آنکھ ہی ہوتی ہے کان نہیں ہوتا۔ اور آنکھ قوت باصرہ ہی کا خلیفہ ہوتی ہے قوت سامعہ کا خلیفہ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی اعتقاد مذکور کا خلیفہ وہی اعمال ہوں گے جن کو وہ نسبت حاصل ہو اور اعمال نہ ہوں گے۔ اور وہ اعمال بھی اسی

اعتقاد کا خلیفہ سمجھے جائیں گے اور اعتقاد کا خلیفہ نہ ہوں گے۔ سو جیسے بدن انسانی کو دیکھ کر سارے معاملات جسمانی انسان ہی کے مناسب کئے جاتے ہیں گو اس کے پردہ میں روح خنزیری کیوں نہ ہو اور جسم خنزیر ہو تو سارے معاملات جسمانی خنزیری کے مناسب کئے جائیں گے۔ گو اس کے پردہ میں روح انسان ہی کیوں نہ ہو ایسے ہی سجدہ وغیرہ اعمال کو جن کو اعتقاد مذکور کے ساتھ نسبت مذکور حاصل ہو عبادت ہی کہیں گے اگرچہ اس شخص کی نسبت جس کو سجدہ کرتا ہے یہ اعتقاد مذکور حاصل نہ ہو۔

ایمان کے لئے عبادات کا لزوم

اس مثال کی تمہید کے بعد یہ گذارش ہے کہ جو شخص خدا کو مالک نفع وضرر سمجھے گا۔ اور اپنے حدوث وبقاء یعنی پیدائش اور دوام میں اسی طرح اس کی احتیاج ہوگی۔ جیسے دھوپ کو اپنے حدوث وبقاء میں آفتاب کی ہر دم حاجت ہے تو بالضرور اس کو ہر دم خدا کی طرف روئے نیاز ہوگی اور اپنی قدرت کو اس کی قدرت سے مستعار سمجھ کر اسی کے کاموں کے لئے روکے رکھے گا۔ سوا اس کے اس خیال کو یہ بھی لازم ہے کہ جیسے نور مستعار قطعات زمین آفتاب کے نور کا ایک ٹکڑا ہے اس کا پورا نور اس میں نہیں آیا اور اس وجہ سے اس کی بڑائی اور اس کی چھوٹائی لازم ہے۔ ایسے ہی اپنی ہستی کو ایک حصہ حقیر سمجھے اور خدا کے وجود کو عظیم الشان خیال کرے۔ اور جیسے بوجہ علیت آفتاب کا علو مراتب اور زمین کے نور کے مرتبہ میں کمی لازم ہے ایسی ہی خدا کے علو مراتب اور اپنی پستی مرتبہ کا اعتقاد اور اقرار ضرور ہے۔

استقبال قبلہ

مگر روئے نیاز قلبی کا ادھر ہونا دل کی بات ہے احوال جسمانی میں اس کا قائم مقام اگر ہوسکتا ہے تو اس جہت کا استقبال ہوسکتا ہے جو بمنزل آئینہ جو بعض اوقات تجلی گاہ آفتاب بن جاتا ہے عالم اجسام میں خدا کی تجلی گاہ ہو۔

نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا

اوراس کے کام کے لئے اپنی قدرت کے روکے رکھنے کے مقابلہ میں اگر ہے تو اپنے ہاتھوں کا باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے جو اس کی طرف مشیر ہے کہ خدمت کے لئے استادہ ہے۔

رکوع

اوراس کی عظمت کے لحاظ کے بعد جو اپنے نفس کی تحقیر کی کیفیت اپنے دل پر طاری ہوتی چاہیے۔ عالم اجسام میں اس کے قائم مقام اوراس کے مقابلہ میں اگر ہے تو جھک جاتا ہے۔ جس کو اصطلاح اہل اسلام میں رکوع کہتے ہیں۔

سجدہ

اوراس کے علو مراتب کے اعتقاد کے بعد جو اپنی پستی کے خیال کی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں اس کے قائم مقام اس بدن کے احوال وافعال میں اگر ہے تو یہ ہے کہ اپنا سر اور منہ جو محل عزت سمجھے جاتے ہیں زمین پر رکھے اور ناک اس کے خاک آستانہ پر رگڑے۔ اس کو اہل اسلام سجدہ کہتے ہیں۔

نماز کے افعال خدا کے سوا کسی اور کے لئے بجالانا شرک ہے

مگر جب ان افعال مذکورہ کو ان امور قلبیہ کے ساتھ وہ نسبت ہوئی جو بدن کو روح کے ساتھ تو جیسے بدن انسانی کو بوجہ نسبت مذکور انسان کہتے ہیں ایسے ہی افعال مذکورہ کو بوجہ نسبت مذکورہ عبادت کہنا لازم ہوگا اور سوا خدا کے اور کسی کے لئے ان افعال کا بجالانا روا نہ ہوگا من جملہ شرک سمجھا جائے گا۔

زکوۃ

اب اور سنئے ! جب بوجہ اعتقاد و احوال مشار الیہا و احوال مذکورہ بندے نے یہ ثابت کر دکھایا کہ میں سراپا اطاعت ہوں تو من جملہ ملازمان بارگاہ احکم الحاکمین سمجھا جائے گا۔ اور باین وجہ کہ اموال دنیوی مملوک خداوند مالک الملک ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت معروض ہو چکا ہے اور پھر وہ اموال کسی قدر یہ کسی قدر بندہ کے قبض و تصرف میں رہتے ہیں اس لئے بندہ ان اموال کی نسبت خازن و امین سمجھا جائے گا اور اس کے صرف میں تابع فرمان خداوندی رہا کرے گا اور جو کچھ خرچ کرے گا خدا کا مال سمجھ کر حسب اجازت خداوندی صرف کیا جائے گا۔ خود کھائے گا اور اپنے صرف میں لائے گا۔ تو خدا کی اجازت سے کھائے گا اور صرف میں لائے گا۔ اور کسی دوسرے کو دے دلائے گا تو حسب اجازت خداوندی دے دلائے گا۔ مگر خداوند کریم کے لطف و رحمت سے یہ بعید ہے کہ خود قابض و امین حاجت مند ہو اور پھر اوروں کو دلوا دے۔ علی ہذا القیاس یہ بھی مستبعد ہے کہ ایک شخص کی حفاظت و حراست میں خزانہ کثیر موجود ہو اور پھر محتاجوں کو ترسائے اور نہ دلوائے۔ اس لئے یہ بات قرین حکمت ہے کہ تھوڑے اموال میں سے تو کسی اور کو نہ دلوائیں اور زیادہ ہو تو اوروں کے لئے حصہ تجویز کر دیں اس

صورت میں اس بندہ کا حصہ مذکور کو دینا اور حسب ارشاد خداوندی صرف کرنا بطور نیابت ہوگا۔ یعنی جیسے خادم اگر حسب اجازت اپنے آقا کے مال میں سے کسی کو کچھ دیتا ہے تو وہ آقا کا دیا سمجھا جاتا ہے اور خادم محض نائب داد و دہش ہوتا ہے۔ اس قسم کی عبادت کو اہل اسلام زکوۃ کہتے ہیں۔ یہ دونوں (نماز اور زکوۃ) جس میں سے ایک (نماز) تو بجمیع الوجوہ عبادت ہے اور دوسری بات (زکوۃ) بوجہ مذکور تو نیابت اور بوجہ فرماں برداری عبادت ہے خدا کے مالک الملک اور احکم الحاکمین ہونے کا ثمرہ ہے جس کے اثبات سے بحمد اللہ فراغت ہو چکی۔

تمہید صوم و حج

اب رہی خدا کی محبوبیت اور اس کی خوبیاں جس کو جمال سے تعبیر کیجئے تو بجا ہے اس کے متعلق بھی دو ہی باتیں ہونی چاہئیں۔ ایک تو خدا کے سوا اور چیزوں سے بے غرضی کیونکہ جب طلب محبت محبوبان مجازی میں کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی تو محبوب حقیقی کی محبت میں یہ بات کیوں نہ ہوگی، دوسرے اس بے غرضی کے بعد اپنے محبوب یعنی خدا کے شوق میں محو ہو جانا۔ اور پھر ہنگامے وقت بھی وجد ہے، کبھی کسی صحرا میں تصور یار میں عرض و معروض ہے، کبھی ناصح سے بیزاری، کبھی با اخلاص جان و مال قربان کرنے کی تیاری۔ علی ہذا القیاس جو جو کیفیتیں ہوا کرتی ہیں۔

صوم

سو پہلی بات کے مقابلہ میں اور اس کے قائم مقام تو روزے ہیں جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غلبہ محبت الٰہی میں نہ کھانے سے مطلب رہا نہ پینے کی حاجت، نہ مرد کو عورت سے غرض نہ عورت کو مرد کا خیال۔ اور جب انہیں باتوں سے دست برداری ہے تو اور

کیا رہ گیا؟ سوا ان کے جو کچھ ہے یا ان کے حاصل کرنے کے سامان ہیں جیسے کھیتی، نوکری، تجارت، مزدوری، یا ان کا نتیجہ ہے جیسا روٹی امراض جو کھانے پینے وغیرہ سے حادث ہوتے ہیں۔

حج یعنی احرام، طواف، وقوف عرفہ، رمی جمار و قربانی

اور دوسری بات کے مقابلہ میں اول تو تقاضائے شوق اس طرف کی راہ لیتے ہیں جہاں تجلی ربانی ہو۔ اور پھر وہ بھی اس کیفیت سے کہ نہ سر کی خبر نہ پاؤں کا ہوش، نہ ناخنوں کی پرواہ نہ بالوں کی غور و پرداخت، سر برہنہ، پا برہنہ، ناخن بڑھے ہوئے، بال بڑھے ہوئے، پریشان صورت غمزدہ زاں چلا جاتا ہے۔ اس کو اہل اسلام احرام کہتے ہیں اور وہاں جا کر کبھی وجد میں گھومتا ہے اور کبھی ادھر سے ادھر نکل جاتا ہے اور ادھر سے ادھر نکل آتا ہے اس کو طواف کہتے ہیں۔ اس کے بعد صحرائے عرفات میں تضرع و زاری ہے اور پھر تا تاوان یعنی شیطان کے خاص مکان پر سنگ باری ہے اور چونکہ عاشق کے حق میں نصیحت ایسی ہے جیسے جلتے توے پر پانی ڈال دیجئے تو اس لئے بعد سنگ باراں تقاضائے اخلاص جان و مال کے فدا کرنے کی تیاری یعنی قربانی ہے اور جاں فشانی ہے اس قسم کی عبادت کو حج کہتے ہیں۔

حکمت توالی رمضان و اشہر حج

مگر غیر محبوب سے بے غرضی جس کے مقابلہ میں رمضان کے روزے ہیں اور شوق و محبت و وجد و تضرع و اخلاص میں باہم ارتباط تھا۔ اس لئے بعد رمضان ہی احرام کے شروع کرنے کے دن ہیں۔ یعنی شوال و ذیقعدہ، عشرہ الحجہ کو اس کام کے لئے رکھا۔

نماز وزکوۃ وصوم وحج کا ارتباط

الغرض ادھر تو نماز وزکوۃ میں باہم ارتباط ہے اور ادھر روزوں اور حج میں باہم ارتباط ہے۔ اتنا فرق ہے کہ وہاں اصل عبادت جو بجمیع الوجوہ عبادت ہے یعنی نماز مقدم ہے اور زکوۃ جو بوجہ فرماں برداری عبادت ہے اس کے تابع اور اس کے بعد اور یہاں رمضان کے روزے جو حقیقت میں عبادت نہیں۔ ورنہ خدا کو معبود ہو کر عابد ہونا پڑے گا۔ کیونکہ وہ بھی نہ کھائے نہ پیئے نہ عورت کے پاس جائے۔ بلکہ بوجہ فرماں برداری عبادت ہے مقدم ہیں۔ اور حج جو اصل میں عبادت ہے اور بجمیع الوجوہ اس کا عبادت ہونا ظاہر ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اس سے موخر۔ وجہ اس کی خود ظاہر ہے وہاں تو نماز کے بعد منصب نیابت وخدمت گزاری میسر آتا ہے اور یہاں عشق کی اول منزل یہی ہے کہ غیر خدا پر خاک ڈالے۔

حسن اخلاق آثار حب فی اللہ سے ہیں اور جہاد ومناظرہ آثار بغض فی اللہ سے

اس کے بعد اور سنئے جب بندہ مملوک اور محکوم خدا ٹھہرا، ادھر خدا کا محب ومخلص بنا تو بالضرور دو باتیں اس کو بتقاضائے غلامی ومحبت کرنی پڑیں گی۔ ایک تو جو خدا کے دوست ہوں جان مال سے ان کی مدد کرے اور جو خدا کے دشمن ہوں ان کی جان ومال کی تاک میں رہے اور ان کی تذلیل سے نہ چوکے پہلے کو حب فی اللہ اور دوسرے کو بغض فی اللہ کہتے ہیں۔

سخاوت، مروت، ایثار، حسن اخلاق، وحیا وصلہ رحمی، عیب پوشی، نصیحت، خیرخواہی وغیرہ اہل اسلام کے ساتھ اول سے متعلق ہیں، اور جہاد اور جزیہ کا لینا اور غنیمت کا لینا اور مناظرہ

وغیرہ دوسرے سے متعلق ہیں۔

شرک فی العبادۃ کی تفسیر

اور سنئے! ان سب باتوں کو اگر غیر خدا کی خوشنودی کے لئے کرے اور نیت عبادت ہو تو یہ سب کی سب باتیں شرک ہو جائیں گی۔ ورنہ نماز کے ارکان اور حج کے ارکان تو شرک ہوں گے، اور چیزوں کے ادا کرنے میں بغیر نیت عبادت شرک نہ ہے۔ وجہ اس تفریق کی یہی ہے کہ اصل عبادت یہ دو ہی باتیں ہیں اور ان کی ہر بات خدا کی عظمت اور اس کے مطاع ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

رکن ثانی: ضرورتِ رسالت

ان تقریرات لطیف کے بعد پھر یہ گذارش ہے کہ خداوند عالم جب حاکم اور مطاع ومحبوب ٹھیرا تو اس کی رضا جوئی ہمارے ذمے فرض ہوئی۔ اور اس کی رضا کے موافق کام کرنا ہمارے ذمے لازم ہوا۔ مگر یہ بات بے اطلاع رضا وغیر رضا متصور نہیں مگر رضا کی اطلاع کا حال یہ ہے کہ ہماری تمہاری رضا غیر رضا بھی بدون ہمارے بتلائے کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ خداوند عالم کی رضا، غیر رضا بے اس کے بتلائے کسی کو کیونکر معلوم ہوسکے۔ یہاں تو یہ حال کہ ہم جسمانی ہیں اور جسم سے زیادہ کوئی چیز ظاہر نہیں۔

پھر اس پر یہ حال ہے کہ سینے سے سینہ ملادیں اور دل کو چیر کر دکھلادیں تو بھی دل کی بات دوسرے کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ خدائی عالم تو سب سے زیادہ لطیف ہے۔ اسی وجہ سے آج تک کسی کو دکھلائی نہیں دیا۔ پھر اس کے دل کی بات بے اس کے بتلائے کسی کو کیوں کر معلوم ہوسکے۔ اور ایک دو بات اگر بدلالت عقل سلیم کسی کے نزدیک لائق امر ونہی خداوندی معلوم بھی ہوں تو اوّل اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خداوند عالم قابلیت امر ونہی کا پابند ہی رہے۔ کہ (کیا) عجب ہے کہ بوجہ خود مختاری وبے نیازی اور بکچھ حکم دیدے۔ علاوہ بریں اس قسم کے علم اجمالی سے کیا کام چلتا ہے۔ جب تک تفصیل اعمال من اولہٖ الی آخرہٖ معلوم نہ ہوجائے تعمیل حکم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اس کے اظہار کا ارشاد ہے۔ مگر اس کی شان عالی کو دیکھئے تو یہ بات کب ہوسکتی ہے کہ خداوند عالم ہر کس وناکس کو اپنی رضا، غیر رضا کی خبر دے اور ہر کسی کو منہ لگائے۔ بادشاہان دنیا اس تھوڑے سے خوف پر اپنے ہی بنی نوع سے نہیں کہتے۔ دوکان

دوکان اور مکان مکان پر کہتے پھرتے ہیں۔ مقربان بارگاہی سے کہہ دیتے ہیں۔ وہ اوروں کو سنا دیتے ہیں۔ اور بذریعہ اشتہارات و منادی اعلان کرا دیتے ہیں۔ خداوند عالم کو ایسا کیا کم سمجھ لیا ہے کہ وہ ہر کسی سے کہتا پھرے وہاں بھی یہی ہوگا کہ اپنے مقربوں اور اپنے خواصوں سے فرمائے اور وہ اوروں کو پہنچائیں ایسے لوگوں کو اہل اسلام انبیاء اور پیغمبر اور رسول کہتے ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام

لیکن دنیا کے تقرب اور خواصی کے لئے سراپا اطاعت ہونا ضرور ہے۔ اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے اور مسند قرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ وہ مقرب جن پر اسرار و مافی الضمیر آشکارا کئے جائیں یعنی اصول احکام سے اطلاع دی جائے ظاہر و باطن میں مطیع ہوں۔ مگر جس کو خداوند علیم و خبیر باعتبار ظاہر و باطن مطیع و فرماں بردار سمجھے گا اس میں غلطی ممکن نہیں۔ البتہ بادشاہان دنیا موافق و مخالف و مطیع و عاصی و مخلص و مکار کے سمجھنے میں بسا اوقات غلطی کھا جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جس کو مطیع و مخلص سمجھا تھا وہ ایسا نہ نکلے، یا بادشاہ کو بوجہ غلطی اس کی طرف گمان مخالفت و مکاری پیدا ہو جائے اور اس لئے دربار سے نکالا جائے۔ مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ کے مقرب بوجہ عدم امکان غلط فہمی ہمیشہ مطیع و فرماں برداری رہیں گے۔

انبیاء علیہم السلام اپنے منصب سے معزول نہیں ہوتے۔

دوزخ جنت کے مالک نہیں، گنہگاروں کی شفاعت کریں گے

نظر بریں یہ لازم ہے کہ انبیاء معصوم بھی ہوں اور مرتبہ تقرب نبوت سے برطرف نہ کئے جائیں، کو خدمت نبوت کی تخفیف ہو جائے۔ لیکن جیسے مقربان بادشاہی اور خواص سلطانی مطیع ومقرب ہوتے ہیں شریک خدائی نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کو یہ تو اختیار نہ ہو سکا کہ کسی کو بطور خود جنت یا جہنم میں داخل کریں۔ البتہ بوجہ تقرب یہ ممکن ہے کہ وہ بکمال ادب کسی کی سفارش کریں یا کسی کی شکایت کریں۔ احباب کی سفارش کو جو انبیاء (علیہم السلام) در بارہ ترقی مدارج یا مغفرت معاصی، خدا کی درگاہ میں کریں گے اہل اسلام شفاعت کہتے ہیں۔

ابطال کفارۂ مزعومۂ نصاریٰ

الغرض انبیاء علیہم السلام کی معصومیت اور ان کی شفاعت تو قرین عقل ہے۔ پر ان کی گنہگاری اور در بارۂ عطائے جنت یا دخال ان کی خودمختاری ہرگز قرین عقل نہیں اور نہ یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ کسی کے عوض کوئی جنت میں چلا جائے اور کسی کے عوض کوئی دوزخ میں رہ جائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت اور عداوت کے لئے کوئی وجہ ضرور ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انعام اور سزا کے لئے سبب کی حاجت ہے۔ جہاں جہاں وہ اسباب موجود ہوں گے وہاں وہاں محبت اور عداوت ہوگی، وہاں وہاں عنایت اور التفات اور کشیدگی اور انقباض بھی ضرور ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حسن جمال اور حسن خصال اور قرابت اور کمال اور احسان اور اعطاء مال تو کوئی کرے اور محبت ان سے ہو جائے جن کی صورت اچھی نہ سیرت بھلی قرابت ہے نہ

کمال ہے۔ احسان ہے نہ عطا، مال ہے۔ اچھی در اچھی، احسان کے بدلے نقصان، راحت کے عوض ایذاء، بھلائی کے عوض برائی کرتے رہتے ہیں۔ باوجود اتنی ناانصافیوں کے یہ بات تو بنی آدم میں بھی نہیں، خداوند داد گر میں یہ بات کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اطاعت کوئی کرے اور ثواب کا مستحق کوئی ہو جائے۔ گناہ کوئی کرے اور سزا کسی کو دی جائے۔ تابعداری تو انبیاء علیہم السلام کریں اور مرحوم امتی ہو جائیں، اور گناہ و تقصیر تو امتی کریں اور ملعون انبیاء علیہم السلام ہو جائیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اور انبیاء بدستور ویسے ہی بارگاہ قرب میں اپنی شان و عظمت کے ساتھ موجود ہیں۔ نہ کبھی وہ عذاب میں گرفتار ہوئے نہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اے حضرات نصاریٰ! یہ سخت گستاخی ہے جو تم صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت تجویز کرتے ہو۔

مدار نبوت تین کمالوں پر ہے

اس تقریر کے ملاحظہ کرنے والوں کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ نبوت کے لئے اول یہ ضروری ہے کہ ظاہر و باطن میں موافق مرضی خداوندی ہوں اور ظاہر و باطن سے اطاعت خدا کے لئے تیار ہوں اس لئے کہ جو اپنے موافق مرضی ہوتا ہے وہ ہی مقرب ربانی ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص ظاہر و باطن دونوں طرح مطیع و فرمانبردار ہو وہی شخص حاکم صاحب خدا ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ بے تقرب بادشاہ سے کلام و گفتگو کوئی نہیں کر سکتا۔ اور بے تقرب چوب دار بادشاہی کسی کے پاس سلام و پیام بادشاہی نہیں لا سکتا ہے۔ اسی طرح بے تقرب شرف ہم کلامی خداوندی میسر نہیں آ سکتی۔ اور بے تقرب ربانی ملائکہ سلام و پیام خداوندی نہیں لا سکتے۔ مگر بنائے تقرب جب موافق مرضی پر ہوئی تو بالضرور نبی میں تین باتیں ضرور ہوں گی۔

محبت خداوند

اول تو یہ کہ اخلاص و محبت خداوندی اس قدر ہو کہ ارادہ معصیت کی گنجائش ہی نہ ہو۔

اخلاق حمیدہ

دوسرے یہ کہ اخلاق حمیدہ وہ پسندیدہ ہوں کیونکہ ہر شخص اور ہر کام کرنے والا بھی اخلاق کے موافق اور مناسب کام کیا کرتا ہے۔ سخی دیا کرتا ہے۔ بخیل جمع کیا کرتے ہیں۔ خوش اخلاق با اخلاق سے پیش آتے ہیں اور راحت پہنچاتے ہیں۔ اور بد اخلاق بدی سے پیش آتے ہیں اور ایذا دیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہر کار ایک خصلت سے مربوط ہوگا۔ اگر اچھی خصلت سے مربوط ہے تو اچھا ہوگا بُری سے مربوط ہے تو بُرا ہوگا۔ اور اخلاق کا اچھا بُرا ہونا اس پر منحصر ہے کہ خدا کے اخلاق کے موافق یا مخالف ہو جو خلق کے موافق ہوگا وہ اچھا سمجھا جائے گا جو مخالف ہوگا وہ بُرا ہوگا۔ اس لئے جو باتیں موافق اخلاق خداوندی ہوں اُن کا بُرا کہنا بجز ناقص فہموں کے اور کسی کا کام نہیں۔ مثلاً خداوند عالم بالاتفاق سب کے نزدیک اچھوں سے خوش ہوتا ہے اور بُروں سے ناخوش۔ ان کو انعام دیتا ہے ان کو سزا پہنچاتا ہے۔ پھر جو شخص ہو بہو ایسا ہو اس کو اوروں سے کامل اور جان و دل سے محبوب رکھنا چاہئے۔ نہ یہ کہ بجائے محبت، عداوت اور بجائے تعریف اُس میں عیب نکالنے لگیں۔ اس وقت یہ حضرات نصاریٰ کا اعتراض جہاد جو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم پر کرتے ہیں سراسر ناانصافی ہوگی۔ یہ دو باتیں یعنی اعمال اور اخلاق تو ایک قسم کی باتیں ہیں یعنی کرنے کی باتیں ہیں اور معاملات سے متعلق ہیں۔

کمال عقل وفہم

تیسری بات جو ازقسم دوم ہے وہ خوبی عقل وفہم ہے۔ کیونکہ اول تو بدفہمی خود ایک ایسا عیب ہے کہ کیا کہیے دوسرے تقرب مقربین خود اسی غرض سے ہوتا ہے کہ بات کہے تو سمجھ جائیں اور سمجھ کر خود بھی تعمیل کریں اوروں سے بھی کرائیں۔

عقل وفہم امت، انبیاء کے عقل وفہم کا پرتو ہے

اس لئے انبیاء علیہم السلام خدا اور امت کے بیچ میں ایسے ہوں گے جیسے آفتاب کے اور زمین کے بیچ میں قمر یعنی جیسے نور قمر آفتاب سے ماخوذ ہوتا ہے اور زمین تک پہنچتا ہے اور در حقیقت مادہ نورانی زمین وہ نور قمری ہوتا ہے ایسے ہی مادہ علم وفہم امت انبیاء جہاد سے ماخوذ ہوتا ہے۔ مگر مادہ علم وفہم وہی عقل ہے۔ اس صورت میں عقل وفہم امت بالضرور مثل چاندنی جو پرتوہ نور قمر ہوتی ہے پرتوہ عقل وفہم انبیاء علیہم السلام ہوگا۔

حیاتِ امت، انبیاء علیہم السلام کی حیات کا پرتو ہے

اور اس وجہ سے یہ لازم ہے کہ مادہ حیات امت بھی انبیاء کی حیات سے ماخوذ ہو کیونکہ عقل حیات سے جدا نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ حیات نہ ہو اور عقل ہو۔

تمام اخلاق امت، اخلاق انبیاء علیہم السلام سے ماخوذ ہیں

اور جب حیاتِ امت حیات انبیاء سے ماخوذ ہوئی۔ تو بالضرور تمام اخلاق امت اخلاق انبیاء سے ماخوذ ہوں گے۔ بشرطیکہ امت گمراہ نہ ہو۔ کیونکہ امت گمراہ حقیقت میں امت ہی نہیں ہوتی۔

مثال امت

بالجملہ امت اور نبی میں یہ فرق ضرور ہے اس لئے امت کی فہم اور ان کے اخلاق اور اعمال اگر اچھے بھی ہوئے تو ایسے ہوں گے جیسے زمین کا چاندنا اپنی ذات سے اچھی چیز ہے مگر مثل نور قمر دوسروں تک پہنچ نہیں سکتا اور اگر پہنچا بھی تو ایسا پہنچتا ہے جیسے چاندنی رات میں زمین کی چاندنی کے باعث والان کے اندر اجالا ہو جاتا ہے۔

تفاضل افراد امت

الغرض بنائے تقرب ان تین باتوں پر ہے بشرطیکہ اوروں کا مادہ فہم و اخلاق ان کے فہم و اخلاق سے ایسی نسبت رکھتا ہو جیسے معروض ہوا۔ اس کے بعد تفاوت اخلاق امت ایسا ہوگا جیسا اشیائے مختلف الالوان کا ایک نور سے مختلف طور سے اچھا برا معلوم ہونا۔

معجزہ ثمرہ نبوت ہے، مدار نبوت نہیں

الغرض اصل نبوت تو ان دو باتوں کا مقتضی ہے کہ فہم سلیم و اخلاق حمیدہ اس قدر ہوں۔ رہے معجزات وہ بعد عطائے نبوت عطا کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جیسے اظہار معجزات کے امتحان میں نمبر اول پایا اس کو نبوت عطا کی ورنہ ناکام رہا چنانچہ ظاہر ہے۔ اس لئے اہل عقل کو لازم ہے کہ اول فہم و اخلاق و اعمال کو میزان عقل میں تولیں اور پھر بولیں کہ کون نبی ہے اور کون نہیں۔

تمام انبیاء پر بلا تفریق ایمان لانا اہل اسلام تو سب ہی انبیاء علیہم السلام کے درم ناخریدہ غلام ہیں۔ خاص کر ان میں ان اولوالعزموں کے جن کی نا شہرہ اولوالعزمی اور علو ہمت سے

دین خداوندی نے بہت شیوع پایا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اعتقاد اور محبت اہل اسلام کے نزدیک جزو ایمان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں

مگر ان سے اور باقی تمام انبیاء سے بڑھ کر حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کو سمجھتے ہیں اور ان کو سب میں افضل اور سب کا سردار جانتے ہیں۔ اہل انصاف کے لئے تو بشرط فہم سلیم موازنہ احوال محمدی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اور احوال دیگر انبیاء کافی ہے۔ ملک عرب کی جہالت اور درشت مزاجی اور گردن کشی کون نہیں جانتا۔ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ نہ کوئی کتاب آسمانی ہو نہ غیر آسمانی اور اخلاق کا یہ حال کہ قتل کر دینا ایک بات ہو۔ فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کسی بادشاہ کے بھی مطیع نہ ہوئے۔ جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے خشک ملک میں شاد وخرم عمر گزاریں۔ ایسے جاہلوں گردن کشوں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا۔ چہ جائیکہ علوم الٰہیات واخلاق وسیاست مدنی میں اور علم معاملات وعبادات میں رشک افلاطون وارسطو ودیگر حکمائے نامدار بنا دیا۔ اعتبار نہ ہو تو اہل اسلام کی کتب اور ان کی کتب کو موازنہ کر کے دیکھیں۔ مطالعہ کنان کتب فریقین کو معلوم ہوگا کہ ان علوم میں اہل اسلام تمام عالم کے علماء پر سبقت لے گئے۔ نہ یہ تدقیقات کہیں ہیں نہ یہ تحقیقات کہیں ہیں۔ جن کے شاگردوں کے علوم کا یہ حال ہے خود موجد علوم کا کیا حال ہوگا۔ اگر یہ بھی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

معجزاتِ علمیہ، معجزاتِ عملیہ سے افضل ہیں

صاحبو! انصاف کرو تو معلوم ہو کہ یہ معجزہ اور انبیاء کے معجزات سے کس قدر بڑھا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ علم کو عمل پر شرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فن میں اس فن کے استادوں کی تعظیم کی جاتی ہے۔ ہر ہر سرشتہ میں افسروں کو باوجودیکہ ان کے کام میں بمقابلہ خدمت اجاع بہت کم محنت ہوتی ہے۔ تنخواہ زیادہ دیتے ہیں یہ شرف علم نہیں تو اور کیا ہے۔ خود انبیاء ہی کو دیکھو۔ امتی آدمی بسا اوقات مجاہدہ وریاضت میں اُن سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر مرتبہ میں انبیاء کے برابر نہیں ہو سکتے۔ وجہ اس کی بجز شرف علم وتعلیم اور کیا ہے؟ الغرض بوجہ علم وتعلیم ہی انبیاء امتیوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ بوجہ عبادت وریاضت ممتاز نہیں ہوتے۔ مگر جب یہ ہے تو پھر علم عمل سے بالضرور افضل ہوگا۔ اس لئے معجزات علمیہ معجزات عملیہ سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

معجزاتِ علمیہ وعملیہ کی تفسیر

مگر معجزات عملی اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کرکے ایسا کام کردکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجائیں۔ اس صورت میں معجزات علمی اس کا نام ہوگا کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کرکے ایسے علوم ظاہر کرے کہ اور اقران وامثال اُس کے مقابلہ میں عاجز آجائیں۔

تفاضل علوم باعتبار تفاضل معلومات

مگر علوم میں بھی فرق ہے یعنی جیسی گلاب ہو یا پیشاب ہو دیکھنے میں دونوں برابر ہیں۔ مگر

جس کو دیکھتے ہیں اس میں اتنا تفاوت ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ ایک پاک اور خوشبودار دوسرا ناپاک اور بدبودار۔ ایسے ہی علم وصفات خداوندی اور علم اسرار احکام خداوندی اور علم معلومات واقعیہ میں یہی فرق ہے۔ بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سے زیادہ فرق ہے اس لئے کہ گلاب و پیشاب میں اتنا تو اتحاد ہے کہ یہ بھی مخلوق وہ بھی مخلوق۔ خالق اور مخلوق میں تو اتنا بھی اتحاد اور مناسبت نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کی پیشین گوئیاں دیگر انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر ہیں

ادھر دیکھئے علم وقائع میں بھی باہم فرق ہے دنیا کے وقائع کی اگر کوئی شخص خبر دے تو پھر ورے ہی کی خبر دیتا ہے۔ پر جو شخص وقائع آخرت کی خبر دیتا ہے وہ دور تک کی خبر دیتا ہے اور چونکہ خبر مستقبل کا اعجاز بہ نسبت ماضی کے زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ یہاں تو کسی قسم کی اطلاع کا بھی احتمال ہے۔ پر مستقبل میں یہ احتمال بھی نہیں ہوتا اس لئے جو شخص کثرت سے امور مستقبلہ کی خبر دے اور امور مستقبلہ بھی بہت دور دور کے بیان کرے تو اس کا اعجاز علم وقائع بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہوگا۔ اب دیکھئے کس کی پیشین گوئیاں زیادہ ہیں اور پھر وہ بھی کہاں کہاں تک اور کس کس قدر دور دراز زمانہ کی باتیں ہیں۔

رہا یہ احتمال کہ آخرت تک پیشین گوئیوں کا صدق اور کذب کس کو معلوم ہے۔ اس کا یہ جواب ہے کہ کوئی پیشین گوئی کیوں نہ ہو قبل وقوع سب کا یہی حال ہوتا ہے۔ اگر دو چار گھڑی پیشتر کی ہے تب تو اکثر حاضرین کو معلوم ہوگا۔ ورنہ بیان کسی کے سامنے کی جاتی ہے اور ظہور کسی کے سامنے ہوتا ہے۔ توراۃ کی پیشین گوئیوں کو دیکھ لیجئے بعض بعض تو اب تک

ظہور میں نہیں آئیں ۔ بہر حال پیشین گوئیاں اگلے ہی زمانے میں جا کر معجزہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی ان کا معجزہ ہونا اگلے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک دو کا صدق بھی اوروں کی تصدیق کیلئے کافی ہوتا ہے۔ ادھر او قرآن صادق اور معجزات دیگر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس لئے قبل ظہور موجب یقین ہو جاتے ہیں۔ ہاں زمانہ ماضی کی باتیں بشرطیکہ وجوہ اطلاع خارج مفقود ہو بے شک اسی وقت معجزے سمجھے جائیں گے۔

بالجملہ ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں بھی اس قدر ہیں کہ کسی اور نبی کی نہیں کسی صاحب کو دعویٰ ہو تو مقابلہ کر کے دیکھیں جن میں سے کثرت سے صادق بھی ہو چکی ہیں۔ مثلاً خلافت کا ہونا، حضرت عثمانؓ اور حضرت حسینؓ کا شہید ہونا اور حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر دو گروہ اعظم کا صلح ہو جانا۔ ملک کسریٰ اور ملک روم کا فتح ہونا۔ بیت المقدس کا فتح ہو جانا، مروانیوں اور عباسیوں کا بادشاہ ہونا، نار حجاز کا ظاہر ہونا، ترکوں کے ہاتھ اہل اسلام پر صدمات کا نازل ہونا۔ جیسا چنگیز خاں کے زمانہ میں ظاہر ہوا۔ سوا ان کے اور بہت سی باتیں ظہور میں آ چکی ہیں۔ ادھر وقائع ماضیہ کا یہ حال کہ باوجود امی ہونے اور کسی عالم نصرانی یہودی کی صحبت کے نہ ہونے کے وقائع انبیائے سابق کے احوال کا بیان فرمانا ایسا روشن ہے بجز متعصب نا انصاف اور کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے اخلاق سب سے اعلیٰ تھے

اب اخلاق کو دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کے بادشاہ یا امیر نہ تھے آپ کا افلاس ایسا نہیں جو کوئی نہ جانتا ہو۔ اس پر ایسے لشکر کی فراہمی جس نے اول تو تمام ملک عرب کو زیر بار

کر دیا اور پھر فارس اور روم اور عراق کو چند عرصہ میں تسخیر کر لیا اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلۂ جہاد کسی کی ایذا رسانی کسی طرح گوارا نہ کی۔ بجز تسخیر اخلاق اور کسی وجہ پر منطبق نہیں آ سکتی۔

الغرض آپ کے علم و اخلاق کے دلائل قطعیہ کے آثار تو اب تک موجود ہیں۔ اس پر بھی کوئی نہ مانے تو وہ جانے۔

باعتبار حاوی علوم کثیرہ ہونے کے قرآن شریف کا اعجاز

علاوہ بریں قرآن شریف جس کو تمام معجزات علمی میں بھی افضل و اعلیٰ کہئے ایسا برہان قاطع کہ کسی سے کسی بات میں اس کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ علوم ذات و صفات و تجلیات و مبدء خلائق، و علم برزخ و علم آخرت و علم اخلاق و علم احوال و علم افعال و علم تاریخ وغیرہ اس قدر ہیں کہ کسی کتاب میں اس قدر نہیں۔ کسی کو دعویٰ ہو تو لاوے اور دکھائے۔

باعتبار فصاحت و بلاغت قرآن شریف کا اعجاز

اس پر فصاحت و بلاغت کا یہ حال کہ آج تک کسی سے مقابلہ نہ ہو سکا مگر ہاں جیسے اجسام محسوسات کے حسن و قبح کا ادراک تو ایک نگاہ اور ایک توجہ میں بھی متصور ہے، اور روح کے کمالات کا ادراک ایک بار متصور نہیں۔ ایسے ہی ان معجزات علمی کی خوبی جو متضمن علوم عجیبہ ہوں ایک بار متصور نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کمال لطافت پر دلالت کرتی ہے۔ نہ نقصان پر۔

قرآن شریف کی فصاحت وبلاغت صاحب ذوق سلیم بڈاچھا سمجھ سکتا ہے

بالجملہ اگر کسی بلید کم فہم کو وجوہ فصاحت و بلاغت قرآنی ظاہر نہ ہوں تو اس سے اس کا نقصان لازم نہیں آتا کمال ہی ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ بریں عبارت قرآنی ہر کس وناکس رند بازاری کے نزدیک بھی اسی طرح اور عبارتوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ جیسے کسی خوشنویس کا خط بدنویس کے خط سے۔ پھر جیسے تناسب خط وخال معشوقاں اور تناسب حروف خط خوشنویساں معلوم ہو جاتا ہے اور پھر کوئی اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔ ایسے ہی تناسب عبارت قرآنی جو وہی فصاحت وبلاغت ہے ہر کسی کو معلوم ہو جاتا ہے پر اس کی حقیقت اس سے زیادہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔

قرآن شریف کلام الٰہی ہے اور تورات وانجیل کتاب الٰہی

الغرض معجزات علمی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے زیادہ ہیں کیونکہ کلام ربانی اور کسی کے لئے نازل نہیں ہوا۔ چنانچہ خود اہل کتاب اس بات کے معترف ہیں کہ الفاظ توریت وانجیل منزل من اللہ نہیں۔ وہاں سے فقط الہام معانی ہوا۔ اور یہاں اکثر انبیاء یا حواریوں نے ان کو اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔ اور اپنا یہ اعتقاد ہے کہ الفاظ کتب سابقہ بھی اسی طرف سے ہیں۔ پر وہ مرتبہ فصاحت وبلاغت جو مناسب شان خداوندی ہے اور کتابوں میں اس لئے نہیں کہ ان کا مہبط خود صفت کلام خداوندی نہیں۔ یا یوں کہو کہ عبارت ملائکہ ہے گو مضامین خداوندی ہیں اور شاید یہی ہے کہ توریت وانجیل کی نسبت قرآن وحدیث ہیں کتاب

اللہ کا لفظ آتا ہے کلام اللہ کا لفظ نہیں آتا۔ اگر ہے تو ایک جا ہے مگر وہاں دو احتمال ہیں ایک تو یہی توریت دوسرے وہ کلام جو بعض بنی اسرائیل نے بمعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سنے تھے۔ اگر وہ کلام تھے تو اس سے توریت کا عبارت خداوندی ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور خود توراۃ مراد ہے تو وہ کلام ایسے سمجھو جیسے بعض شاعر گنواروں سے انہیں کے محاوروں میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس وقت کلام شاعر مذکور اگرچہ بظاہر کلام شاعری سمجھے جائیں گے۔ مگر منشاء اس کلام کا اس کا وہ کمال نہ ہوگا جس کو کمال شاعرانہ اور قوت فصاحت و بلاغت کہتے ہیں۔ ایسے ہی توراۃ کو بھی بہ نسبت خدا خیال فرمائیے اور شاید یہی وجہ ہو کہ دعویٰ اعجاز تورات و انجیل نہ کیا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس معجزہ سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہ تھا۔ چنانچہ اوپر معروض ہو چکا۔

صاحب اعجاز علمی کا صاحب اعجاز عملی سے افضل ہونا

اور بایں وجہ کہ علم تمام اُن صفات سے اعلیٰ ہے جو جو مرتی عالم ہیں۔ یعنی ان صفات کو عالم سے تعلق ہے جیسے علم و قدرت، ارادت، مشیت، کلام، کیونکہ علم کو معلوم اور قدرت کو مقدور اور ارادہ کو مراد اور مشیت کو مرغوب اور کلام کو مخاطب کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ نبی جس کے پاس معجزہ علمی ہو تمام اُن نبیوں سے اعلیٰ درجہ میں ہوگا جو معجزہ عملی رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ جس درجہ کا معجزہ ہوگا وہ معجزہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ صاحب معجزہ اس درجہ میں یکتائے روزگار ہے اور اس فن میں بڑا سردار ہے اس لئے ہمارے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی افضلیت کا اقرار بشرط فہم و انصاف ضرور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا

علی ہذا القیاس جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ علم سے اوپر کوئی ایسی صفت نہیں جس کا عالم سے تعلق ہو۔ تو خواہ مخواہ اس بات کا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم پر تمام مراتب کمال اسی طرح ختم ہو گئے جیسے بادشاہ پر مراتب حکومت ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جیسے بادشاہ کو خاتم احکام کہہ سکتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کو خاتم الکاملین اور خاتم النبیین کہہ سکتے ہیں مگر جس شخص پر مراتب کمال ختم ہو جائیں گے تو بایں وجہ کہ نبوت سب کمالات بشری میں اعلیٰ ہے چنانچہ مسلم بھی ہے اور تقریر متعلق بحث تقرب بھی جو اوپر گزر چکی ہے اس پر شاہد ہے۔

تمام اہل مذاہب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ضروری ہے

اس لئے آپ کے دین کے ظہور کے بعد سب اہل کتاب کو بھی ان کا اتباع ضروری ہوگا۔ کیونکہ حاکم اعلیٰ کا اتباع تو حکام ماتحت کے ذمہ بھی ہوتا ہے رعایا تو کس شمار میں ہیں۔ علاوہ بریں جیسے لارڈ ملٹن کے زمانہ میں لارڈ ملٹن کا اتباع ضروری ہے اس وقت احکام لارڈ نارتھ بروک کا اتباع کافی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کا اتباع باعث نجات سمجھا جاتا ہے ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے زمانہ بابرکات میں اور ان کے بعد انبیاء سابق کا اتباع کافی اور موجب نجات نہیں ہو سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

اور یہی وجہ ہوئی کہ سوائے آپ کے اور کسی نبی نے دعویٰ خاتمیت نہ کیا۔ بلکہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ " جہان کا سردار آتا ہے" خود اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ خاتم نہیں۔ کیوں کہ اشارہ مثال خاتمیت بادشاہ خاتم وہی ہوگا جو سارے جہان کا سردار ہو۔ اس وجہ سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کو سب سے افضل سمجھتے ہیں۔ پھر یہ آپ کا خاتم ہونا آپ کے سردار ہونے پر دلالت کرتا ہے اور بقرینہ دعویٰ خاتمیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم سے منقول ہے یہ بات یقینی سمجھتے ہیں کہ وہ جہان کے سردار جن کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دیتے ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم ہی ہیں۔

تحقیق نسخ

رہا یہ شبہ کہ یہ صورت نسخ احکام کی ہے۔ اور نسخ احکام چونکہ غلطی حکم اول پر دلالت کرتا ہے اور خدا کے علوم اور احکام میں غلطی متصور نہیں۔ اس لئے یہ بات بھی غلط ہوگی کہ سوائے اتباع محمدی اور کسی طرح نجات متصور نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ فقط تبدیلی احکام کو کہتے ہیں۔ غلطی کا اشارہ اس میں سے سمجھ لینا سخت ناانصافی ہے یہ لفظ عربی ہے اس کے معنی ہم سے پوچھتے تھے پھر اعتراض کرتا تھا۔ سنئے خدا کے احکام کا نسخ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے طبیب کا منضج کے نسخہ کی جگہ مسہل کا نسخہ لکھ دینا۔ چنانچہ وہ تقریر بھی جس میں خدا کے احکام بندوں کے حق میں نافع ہونے اور اس کی مناہی کا

اُن کے حق میں مضر ہونے کی طرف اشارہ کرچکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی طبیب کی مثال عرض کرچکا ہوں۔ اس مضمون کے لئے موید ہے۔

نسخ میں اختلاف لفظی ہے

الغرض تبدیلی احکام خداوندی مثل تبدیلی احکام حکام دنیا بوجہ غلطی فہم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس غرض سے ہوتی ہے کہ مثل منسخ حکم اول کا زمانہ نکل گیا اور مثل مسبل حکم ثانی کا زمانہ آ گیا اور اس قسم کے تبدل احکام کے اقرار سے حضرات نصاریٰ بھی منحرف نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ بعض احکام توراۃ کا بوجہ انجیل مبدل ہو جانا سب کو معلوم ہے۔ پھر اگر اس قسم کو نصاریٰ "نسخ" نہ کہیں "تکمیل" کہیں تو فقط لفظوں ہی کا فرق ہوگا۔ معنی وہی رہیں گے اور اگر نسخ ہی کہتے ہیں تو چشم مار وشن دل ما شاد۔

حضرت موسیٰ کے کلیم اللہ ہونے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مساوات لازم نہیں آتی

اس کے بعد یہ گزارش ہے کہ شاید نصاریٰ کو یہ خیال ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا "کلیم" ہونا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا "کلمۃ" ہونا بھی مسلم ہے۔ پھر بوجہ نزول کلام اللہ محمد یوں ہی کو کیا افتخار رہا تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلیم ہونا باین معنی ہے کہ وہ خدا کے مخاطب تھے۔ اور خدا کے کلام اُن کے کان میں آئے۔ یہ نہیں کہ ان کی زبان تک اور ان کے منہ تک بھی نوبت پہنچی ہو اور ظاہر ہے کہ کلام فصیح و بلیغ کا کان میں آ جانا سامع

کا کمال نہیں۔ ورنہ اس حساب سے سب ہی صاحب اعجاز اور صاحب کمال کلام ہو جائیں۔ البتہ کلام بلیغ کا منہ میں آنا اور زبان سے نکلنا البتہ کمال سمجھا جاتا ہے۔ بشرطیکہ اول کسی اور سے نہ سنا ہو فقط خدا ہی کی قدرت وعنایت کا واسطہ ہو۔ سو یہ بات اگر میسر آئی ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کو میسر آئی۔ یہی وجہ ہوئی کہ سوا آپ کے اور کسی نے یہ دعوی نہیں کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تورات کی پیشین گوئی

اس تقریر کے سننے دیکھنے والوں کو انشاء اللہ اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ تورات کی وہ پیشین گوئی جس میں یہ ہے کہ "اس کے منہ میں اپنے کلام ڈالوں گا" بلا شبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت یہ بات بھی آشکارا ہوگئی ہوگی کہ اس پیشین گوئی میں جو اس فقرہ سے اول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ تجھ جیسا نبی پیدا کروں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اور وہ متساوی المراتب ہوں گے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کلام ربانی سے تجھے بھی معاملہ پڑا اور اسے بھی معاملہ پڑے گا۔ مگر چونکہ یہ تشبیہ اگر مطلق رہتی تو کمال مشابہت پر دلالت کرتی۔ جس کا حاصل وہی تساوی مراتب نکلتا۔ اس لئے آگے بطور استثناء و استدراک یہ ارشاد فرمایا کہ اس کے منہ میں اپنے کلام ڈالوں گا۔ تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ تم سے افضل ہوں گے کیونکہ اس وقت وہ نبی بمنزلہ زبان خدا ہوں گے اور ایسی صورت ہو جائے گی جیسے فرض کیجئے کسی کے سر پر بھوت چڑھ جائے اور وہ اس وقت کچھ باتیں کرے یا تاثیر مسمریزم سے کسی عالم کی روح کا پرتو کسی جاہل کی روح پر پڑ جائے اور اس وجہ سے علوم کی باتیں کرنے لگے

جیسے اس وقت متکلم کوئی اور ہی ہوتا ہے پر زبان اسی شخص کی ہوتی ہے اور اسی لئے بظاہر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ یہی شخص باتیں کرتا ہے ایسے ہی یہاں بھی خیال فرما لیجئے۔ اور ظاہر ہے کہ زبان متکلم ہی کی جانب شمار کی جاتی ہے۔ البتہ کان مخاطب کی جانب شمار کئے جاتے ہیں۔ سو جب متکلم خداوند کریم ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم بمنزلہ زبان وترجمان تو بے شک اس حساب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے ساتھ درجہ تساوی میسر نہیں آسکتا۔

مگر جب یہ بات واجب التسلیم ہوئی تو یہ بات آپ چسپاں ہوگئی کہ جو اس نبی کا مخالف ہوگا اس سے میں انتقام لوں گا۔ کیونکہ اس نبی کی مخالفت کو بہ نسبت اور نبیوں کی مخالفت کے زیادہ تر یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی مخالفت ہے اس لئے خدا ہی انتقام لے گا۔ جس طرح خدا کی جانب دربارۂ کلام وہ شمار کئے گئے ایسے ہی دربارۂ انتقام بھی ان کو شمار کر لیجئے اور ان جہادوں کو جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کئے ہیں اس انتقام کا ظہور سمجھ لیجئے۔ گو اور انواع عذاب بھی اس کا تتمہ ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''کلمۃ اللہ'' ہونے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی مساوات لازم نہیں آتی

باقی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ ہونا مخاطب پر فوقیت رکھے گا۔ متکلم پر فوقیت اس سے ثابت نہ ہوگی۔ بلکہ کلمہ کا مفعول متکلم ہی کی افضلیت پر دلالت کرے گا۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کو متکلم کی جانب مانا تو وہی افضل ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام افضل نہ ہوں گے۔

تمام کائنات ''کلماتِ خدا'' ہیں

علاوہ بریں تمام انبیاء بلکہ تمام کائنات کلمات خدا ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کلام حقیقی کلامِ معنوی ہے الفاظ کو فقط بایں وجہ کلام کہہ دیتے ہیں کہ کلام معنوی پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر شے کے بنانے سے پہلے اس کی نسبت کچھ نہ کچھ سمجھ لینا ضرور ہے۔ اس لئے اوّل اس شے کا وجود ذہن میں ہوگا۔ اس کے بعد خارج میں ہوگا۔ اور اس لئے اس شے کو کلمہ کہنا ضرور ہوگا۔ اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں اور اوروں میں اتنا ہی فرق ہوگا کہ ان کی نسبت قرآن میں یہ آیا ہے ''کلمة القاھا الیٰ مریم'' جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کلمہ خدا ہیں خدا نے اس کو مریم کی طرف ڈال دیا۔ غرض خداوندی یہی تھی کہ ان میں کچھ فوقیت نہیں۔ جیسے اور ویسے ہی وہ فقط اتنا ہے کہ بے واسطہ غیر مریم کی طرف ڈالے گئے۔ مگر اس بیان کے باعث وہ اس خطاب کے ساتھ مشہور ہو گئے۔

اس تقریر کے بعد جب یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ منشاء فیض محمدی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم صفت العلم ہے اور وہ سب میں اوّل ہے یہاں تک کہ کلام بھی اس کے بعد میں ہے۔ بلکہ کلام خود اس علم ہی کے طفیل ظہور میں آتی ہے تو پھر یہ تقریر اور بھی چسپاں ہو جاتی ہے۔ الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر مفعول صفت کلام اور ظہور و مظہر صفت کلام ہیں کیونکہ ہر مفعول ظہور و مظہر مصدر ہوتا ہے۔ چنانچہ مشاہدۂ حال دھوپ و زمین سے عیاں ہے۔ اس لئے کہ اوّل مفعول مطلق دوسرا مفعول بہ ہے کہ وہ ظہور ہے یہ مظہر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کو ظہور و مظہر صفت العلم سمجھئے جو کلام کی بھی اصل ہے۔

احیاءِ اموات اثر صفتِ کلام ہے

یہی وجہ ہے کہ تاثیراتِ صفتِ کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ کلام خواص حیات میں سے ہے۔ حالتِ موت میں کلام متصور نہیں جس میں صفتِ کلامِ خداوندی کا زیادہ ظہور ہو اس میں تاثیر احیاء بھی زیادہ ہوگی۔

احیاءِ اموات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اگر ان کا عصا سانپ بن کر زندہ ہو جاتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدق سے پتھر اور سوکھی کھجور کی لکڑی کا ستون زندہ ہو گیا اور پھر تماشا یہ ہے کہ اپنی وہی ہیئت اصلی رہی۔ اگر کسی جانور کی شکل ہو جاتا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا حال ہوا تو یوں تو کہنے کی گنجائش تھی کہ آخر کچھ نہ کچھ زندوں سے مناسبت تو ہے۔ مگر سوکھا ستون روئے اور درد محبت میں چلائے اس میں ہرگز پہلے سے کچھ لگاؤ بھی زندگانی کی نہیں۔ اگر ہوتا تو پھر بھی کچھ مناسبت تھی۔ اس پر شوق و ذوق محبت اور درد فراق نبوی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم جو اس سوکھے ستون سے جمعہ کے روز ایک جم غفیر اور مجمع کثیر میں ظہور میں آیا اور بھی افضلیت محمدی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ درد فراق اور شوق و اشتیاق مذکور کمال ہی درجہ کے ادراک وشعور پر دلالت کرتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عصائے موسوی کو اس ستون کے ساتھ کچھ نسبت نہیں۔ وہاں اس اژدھائے سانپوں کی نوع سے بڑھ کر کوئی بات ثابت نہیں ہوئی اور یہاں وہ وہ آثارِ حیات اس ستون سے نمایاں ہوئے کہ بجز اہل کمال نوعِ انسانی اور کسی سے اس کی امید نہیں۔

علیٰ ہذا القیاس پتھروں کا سلام کرنا اور درختوں کا بعد استماع امر اطاعت کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور پردہ کے لئے دو درختوں کا جھک کر مل جانا اس حیات اور اس ادراک وشعور پر دلالت کرتا ہے کہ حیوانات سے اس کی توقع نہیں ہے۔ اگر ہے تو افراد انسانی ہی سے ہے۔

احیاء اموات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ

علیٰ ہذا القیاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا یا گارے سے جانوروں کی شکل بنا کر زندہ کر دینا بھی اس قسم کے معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ مردہ قبل موت زندہ تھا۔ سوکھا درخت تو کبھی زندہ تھا ہی نہیں ایسے ہی وہ جانور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنا کر اڑاتے تھے باعتبار شکل تو ان کو کسی قدر زندوں سے مناسبت بھی تھی۔ یہاں تو یہ بھی نہ تھا۔ پھر فرق ادراک وشعور اور علاوہ رہا۔ اس پر بھی بوجہ تعصب کوئی شخص اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہے جائے تو اس کا کیا علاج۔ منہ کے آگے آڑ نہیں پہاڑ نہیں جو چاہو سو کہو مگر فکر آخرت بھی ضرور ہے۔

معجزات عملیہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں

اس کے بعد یہ گذارش ہے کہ باعتبار معجزات علمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کا اور انبیاء علیہم السلام سے بڑھا رہنا تو بحکم انصاف ظاہر و باہر ہو گیا۔ بلکہ اس ضمن میں بعض معجزات عملی کی رو سے بھی آپ کی فوقیت اور انبیاء علیہم السلام پر واضح و آشکارا ہو گئی اس لئے

کہ درختوں کا چلنا اور ستون کا رونا من جملہ اعمال ہیں، من جملہ علوم نہیں۔ گو بایں اعتبار کہ اعمال اختیار یہ اور رو دزاری کے لئے اوّل ادراک وشعور اور حیات کی ضرورت ہے ان اعمال سے اول انہیں وقائع میں ظہور معجزہ علمیہ بھی ہو گیا۔

مگر اب اہل انصاف کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ کسی قدر اور گذارش بھی سن لیں تاکہ فوقیت محمدی باعتبار معجزات عملی بھی ظاہر ہو جائے۔

معجزہ تکثیر ماء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اگر پتھر میں پانی نکلتا تھا تو یہاں دست مبارک میں سے نکلتا تھا اور ظاہر ہے کہ پتھروں سے پانی کا نکلنا تنا عجب نہیں جتنا گوشت و پوست میں سے پانی کا نکلنا عجیب ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں پتھر میں سے پانی کے نکلنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسم مبارک موسوی کا یہ کمال تھا اور یہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دست مبارک محمدی منبع فیوض الانتہا ہے۔ بلکہ جب یہ دیکھا جائے کہ کسی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لے کر اس پر آپ نے ہاتھ پھیلا دیا جس سے اس قدر پانی نکلا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا اور لشکر کے جانور سیراب ہو گئے۔ تو یہ تکلم فہم سلیم سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے آئینہ وقت تقابل آفتاب فقط قابل ومفعول ہوتا ہے اور نور افشانی فقط آفتاب ہی کا کام ہے اور یہ کمال نور اسی کی طرف سے آیا ہے۔ آئینہ کی طرف سے نہیں یا کائنات الجو رحوادث مابین ارض وسما میں فاعلیت آسمان کی طرف ہے زمین فقط قابل ہے دوسروں کا کمال لے کر ظاہر کرتی ہے۔ ایسے ہی اس وقت جس وقت آپ نے دست مبارک اس پانی پر رکھا اور یہ معجزہ تکثیر آب نمایاں ہوا تو یوں سمجھو

کہ پانی محض قابل تھا۔ فاعلیت اور ایجاد آپ کی طرف سے تھا۔ یعنی فاعلیت فاعل حقیقی اور ایجاد موجد حقیقی کے سامنے آپ کا دست مبارک ایک واسطہ فیض اور آلہ ایجاد تھا گو اس خدا کو بے ان وسائط کے بھی بنانا آتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طور سے پانی کا پیدا ہونا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ آپ کے دست مبارک کی تاثیر سے ہوا اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں یہ خوبی نہیں نکلتی۔ بلکہ فقط ایک قدرت خدا ثابت ہوتی ہے۔

معجزہ تکثیر طعام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت

علیٰ ہذا القیاس کنوئیں میں آپ کے تھوکنے سے پانی کا زیادہ ہو جانا یا کچھ پڑھنے سے کھانے کا بڑھ جانا بھی آپ کے کمال جسمی پر دلالت کرتا ہے۔ اور فقط یوں ہی روٹیوں کا زیادہ ہو جانا فقط خدا کی قدرت ہی پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کمال جسمی پر دلالت نہیں کرتا۔ ہاں یہ مسلم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے ان امور کا ظہور میں آنا اُن کے تقرب پر دلالت کرتا ہے اور اسی وجہ سے ان کا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ بات تو دونوں جانب یعنی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں برابر موجود ہے۔ اور پھر اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ میں کمال جسمی اور مزید بر آں ہے۔

شفاءِ مرضیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت

علی ہذا القیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ لگانے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا فی الفور صحیح وسالم ہو جانا اور بگڑی ہوئی آنکھ کا آپ کے ہاتھ لگاتے ہی اچھا ہو جانا فقط یوں ہی بیماریوں کے اچھے ہو جانے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں تو اس سے زیادہ کیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہتے ہی بیماروں کو اچھا کر دیا۔ یہ برکت جسمانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پائی جاتی اور یہاں دونوں موجود ہیں۔ کیونکہ اصل فاعل تو پھر بھی خداوند عالم ہی رہا پر بواسطہ جسم محمدی اس اعجوبہ کا ظاہر ہونا بے شک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کا جسم مقدس منبع البرکات ہے۔

معجزہ انشقاق قمر کا سکون آفتاب یا عود آفتاب سے مقابلہ

اور سنئے حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے آفتاب کا ایک جا پر قائم رہنا یا حضرت اسعیا علیہ السلام کے لئے یا کسی اور کے لئے آفتاب کا غروب کے بعد لوٹ آنا اگرچہ معجزہ عظیم الشان ہے مگر انشقاق قمر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ اول تو حکمائے انگلینڈ اور فیثا غورسیوں کے مذہب کے موافق ان دونوں معجزوں میں زمین کا سکون، یا کسی قدر اس کا الٹی حرکت کرنا ثابت ہوگا۔

افلاک کے نفی واثبات کا سماوات پر کوئی اثر نہیں

اور میں جانتا ہوں کہ حضرات پادریان انگلستان بپاس وطن اسی مذہب کو قبول فرمائیں

گے۔ بطلیموسیوں کے مذہب کو یعنی حرکت افلاک وشمس وقمر وکواکب کو تسلیم نہ کریں گے۔ اور اگر دربارہ افلاک مخالفت کا ہونا باعث عدم قبول ہو تو اس کا یہ جواب ہے کہ حکمائے انگلستان کے موافق آسمانوں کے اثبات کی ضرورت نہیں گو ان کے طور پر انکار بھی ضروری نہیں۔ اگر تمام کواکب کو آسمان سے ورے مانئے اور آفتاب مرکز عالم پر تجویز کیجئے اور آسمان سے ورے زمین وغیرہ کا اس کے گرد اگرد متحرک ہونا تجویز کیجئے تو ان کا کچھ نقصان نہیں، نہ ان کی رائے و مذہب میں خلل آ سکتا ہے۔

شق قمر خلاف طبیعت ہے اور سکون آفتاب حقیقت میں سکون زمین

بالجملہ بطور حکماء انگلستان اس معجزہ کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ زمین کی حرکت مبدل بسکون ہو گئی یا اس کی (مسلسل) حرکت کے بدلے تھوڑی دور ادھر کو حرکت ہو گئی۔ مگر بوجہ قرب زمین اس بات میں اتنا تعجب نہیں جتنا انشقاق قمر میں تعجب ہے کیونکہ وہاں ایک تو یہ بات کہ لاکھوں کوس دور اتنی دور اوپر کی طرف تاثیر کا پہنچنا بہ نسبت اس کی کہ اس چیز پر تاثیر ہو جائے جو اپنے زیر قدم ہو اور وہ بھی قدموں سے لگی ہو، کہیں زیادہ ہے۔ علاوہ بریں اس تاثیر اور اس تاثیر میں فرق زمین و آسمان ہے۔ حرکت کا مبدل بسکون ہو جانا اتنا دشوار نہیں جتنا ایک جسم مضبوط کا پھٹ جانا کیونکہ ان اجسام کی حرکت اگر اختیاری ہے تو اختیار سے جیسے حرکت متصور ہے ایسے ہی سکون بھی متصور ہے اور اگر کسی دوسرے کی تحریک سے ان کی حرکت ہے تو اس صورت میں سکون ان کے حق میں اصل مقتضائے طبیعت ہو گا۔ اس صورت میں سکون کا عارض ہو جانا بلکہ ان کے حق میں دشوارت ہو گا جو اس کے قبول سے انکار ہو، پر پھٹ جانا چوں کہ خلاف

طبیعت بے دشوار ہوگا۔ ورنہ چاند کو جاندار فرض کیجئے تو اور بھی اس کے حق میں مصیبت سمجھے۔ اس صورت میں بے شک انشقاق قمر سکون زمین سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہوگا۔

ہر قسم کی حرکت طبعی، یا قسری بلا شعور وارادہ نہیں ہو سکتی

اس پر حرکت معکوس کو خیال کر لیجئے یعنی حرکت زمین اگر اختیاری ہے تب اس کو حرکت معکوس دشوار نہیں ہماری حرکت چونکہ اختیاری ہے اس لئے جس طرف کو ہم چاہیں جا سکتے ہیں اور اگر حرکت زمین کسی دوسرے کی تحریک سے ہے تو اس کی تحریک سے حرکت معکوس بھی ممکن ہے۔ باقی ایسا محرک تجویز کرنا جس کو ادراک وشعور نہ ہو اور اس سے سوا حرکت واحد یعنی ایک طرفی حرکت کے دوسری حرکت صادر ہی نہ ہو سکے اور اس کا نام طبیعت رکھنا انہیں لوگوں کا کام ہے جن کو ادراک وشعور نہ ہو۔ کیونکہ حرکت ہے اس کے متصور نہیں کہ ایک جہت اور ایک جانب راجح اور معین ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بات بے ادراک وشعور ممکن نہیں۔ سو اگر طبیعت خود مرجح ہوتی ہے تب تو اسی کا ادراک وشعور ثابت ہو گیا اس لئے وہ حرکت ارادی ہوگی اور اگر مرجح کسی اور کا ادراک وشعور ہے تو حرکت طبعی قسری یعنی دوسرے کی تحریک سے ہوگی اور حقیقت میں طبیعت کے یہی معنی ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا عربی زبان میں بمعنی مفعول ہونا خود اس بات پر شاہد ہے۔ الحاصل سکون زمین ہو یا حرکت معکوس دونوں طرح انشقاق قمر کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اس پر قرب وبعد وفوقیت وتحتیت محل تاثیر کا فرق مزید برآں رہا۔

کسی کی استدعا قبول ہونی اس کی عظمت ہی پر موقوف نہیں

اور اگر فرض کیجئے حضرات نصاریٰ آفتاب ہی کو متحرک کہیں تب بھی یہی بات ہے کہ سکون آفتاب یا حرکت معکوس آفتاب ارادی ہو یا نہ ہو دونوں طرح شق قمر سے مشکل نہیں۔ البتہ

قرب و بعد محل تاثیر بظاہر یہاں معکوس ہو گیا ہے۔ کیونکہ آفتاب قمر سے دور ہے۔ مگر اول تو متحرکین بالاختیار کا بوجہ امر و نہی و استدعا و التماس دور سے تھام لینا ممکن۔ آدمیوں اور جانوروں میں بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ دور کی آواز پر تھم جاتے ہیں یا چل دیتے ہیں۔ یہ دور سے کسی جسم کا پچھاڑ دینا منصور نہیں۔ سو آفتاب خود اپنے ارادے سے متحرک ہو تب تو حضرت یوشع علیہ السلام کی استدعا کے بعد اس کا ٹھیر جانا حضرت یوشع علیہ السلام کی تاثیر پر اور قوت پر دلالت نہ کرے گا بلکہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ آفتاب نے ان کی ایک بات مان لی۔ سو کسی کا کسی بات کو مان لینا کچھ اس کی عظمت ہی پر منحصر نہیں۔ خدا بندوں کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ تو کیا بندے اس سے بڑھ گئے اور کافروں کی سن لیتا ہے تو کیا وہ کچھ خدا کے مقرب ہو گئے۔ علیٰ ہذا القیاس بسا اوقات امرا و سلاطین مساکین کی عرض معروض سن لیتے ہیں تو کیا مساکین ان سے بڑھ جاتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ استدعا ہی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس بات کی استدعا کی جاتی ہے اس بات میں مستدعی کو کچھ مداخلت نہیں۔ زیادہ نہیں تو وقت استدعا تو ضرور ہی اس کا بے دخل ہونا ثابت ہوگا۔

آفتاب بارادہ خود متحرک ہے

اور اگر آفتاب کسی دوسرے کی تحریک سے متحرک ہے تو پھر اس کا سکون محرک کے ہاتھ میں ہوگا اور حضرت یوشع علیہ السلام کی استدعا گو بظاہر آفتاب سے ہوئی پر حقیقت میں اس محرک سے ہوئی۔ مگر ظاہر الفاظ حکایت اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ آفتاب سے استدعا تھی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں آفتاب کا بارادہ خود متحرک ہونا ثابت ہوگا۔

فلکیات میں خرق والتیام سکون وحرکت معکوس سے زیادہ دشوار ہے

علاوہ بریں بطور عقلاء یونان زوال حرکت فلکیات محال نہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ حرکتیں دائمی ہیں، ضروری نہیں اور ماہران منطق جانتے ہیں کہ مخالفت ضرورت محال ہوتا ہے۔ مخالفت دوام محال نہیں ہوتا۔ اور خرق والتیام فلکیات یعنی افلاک وکواکب وشمس وقمران کے نزدیک من جملہ محالات ہے اور فلکیات کا مجسم باقی رہنا ضروری۔ گو واقع میں وہ محال اور یہ ضروری نہ ہوں لیکن بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی کہ خرق والتیام میں بہ نسبت سکون وحرکت معکوس زیادہ دشواری ہے جو ایسے ایسے عقلاء کو خیال امتناع واستحالہ ہو۔

انشقاق قمر کا معجزات داؤدی سے مقابلہ

اس کے بعد گزارش ہے کہ اس معجزہ کو پتھروں کے نرم ہو جانے یا لوہے کے نرم ہو جانے سے ملایئے۔ اور پھر فرمایئے کہ تفاوت آسمان وزمین ہے کہ نہیں۔

برکت صحبت رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضاء کی خوبی میں کچھ کلام نہیں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے بعض اصحاب کی چھڑی کے سر پر بطفیل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اندھیری رات میں جب وہ آپ کی خدمت سے رخصت ہونے لگے روشنی ہوگئی۔ وہ جانے والے دو شخص تھے جہاں سے راہ جدا ہوئی وہاں سے وہ روشنی دونوں کے ساتھ ہولی۔ اب خیال فرمایئے دست مبارک موسیٰ علیہ السلام اگر جیب میں ڈالنے کے بعد بوجہ قرب

قلب منور روشن ہوا تھا تو اول تو وہ نبی دوسرے نور قلب کا قرب وجوار۔ جیسے بوجہ قرب ارواح اجسام میں ان کے مناسب حیات آجاتی ہے ایسے ہی بوجہ قرب نور قلب دست موسوی میں اس کے مناسب نور آجائے تو کیا دم ہے۔ یہاں تو وہ دونوں صاحب نہ نبی تھے نہ ان کی لکڑی کو قلب سے قرب وجوار نہ اختلال میں وہ قابلیت جو بدن میں بہ نسبت روح ہوتی ہے۔ فقط برکت صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم تھی۔

برکت صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کا دوسرا اثر

اور سنئے! آتش نمرود نے اگر جسم مبارک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ جلایا تو اتنا تعجب انگیز نہیں جتنا اس دستر خوان کا آگ میں نہ جلنا جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس بطور تبرک نبوی تھا۔ اور وہ بھی ایک بار نہیں بارہا اس قسم کا اتفاق ہوا کہ جہاں میل چکناہٹ زیادہ ہو گیا جب ہی آگ میں ڈال دیا اور جب میل چکناہٹ جل گیا جب ہی نکال لیا۔ یہ قصہ مثنوی مولانا روم میں مذکور ہے اور حکایتیں اور کتابوں میں مذکور ہیں۔ مگر خیال فرمایئے کہ ایک تو نہ آدمی کا جلنا اتنا موجب تعجب نہیں جتنا کھجور کے پتوں کے دستر خوان کا اور وہ بھی ایسا جس پر تعجب نہیں چکناہٹ بھی ہوتا ہو۔ دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دستر خوان میں زمین و آسمان کا فرق وہ خود نبی اور نبی بھی کیسے خلیل اللہ اور وہاں دستر خوان میں فقط اتنی بات کہ گاہ بگاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا گیا ہو اور آپ نے اس پر کھانا کھایا ہو۔

معجزات قرآنیہ کا ثبوت اعلیٰ درجہ کا ہے

الحاصل معجزات عملی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم ہی سب میں فائق ہیں اور پھر وہ معجزات جو قرآن میں موجود ہیں ان کا ثبوت تو ایسا تحقیقی کہ کوئی تاریخی بات اس کے ہم

پیدا نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ کوئی کتاب سوائے قرآن مجید عالم میں ایسی نہیں کہ اس کا لفظ لفظ متواتر ہو اور لاکھوں آدمی اس کے حافظ ہوں بلکہ کسی کتاب کا ایک دو حافظ بھی عالم میں شاید نہ ہوں۔

معجزاتِ حدیثیہ کا ثبوت توراۃ وانجیل سے کم نہیں

سو اس کے احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات میں تو توراۃ و انجیل کے ساتھ مساوی ہیں۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ بھی اپنی کتابوں کی نسبت اس بات کے قائل ہیں کہ مضامین احادیثِ وحی سے متعلق پر الفاظ وحی میں نہیں آئے ۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن و حدیث کو باہم ممتاز سمجھتے ہیں۔

اور قرآن شریف کو جو نماز میں پڑھتے اور احادیث کو نہیں پڑھتے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہ وقت گویا ہم کلامی خدا ہے اس وقت وہی الفاظ چاہئیں جو خدا کے یہاں سے آئے ہیں۔ زیادہ فرصت نہیں اور نہ زیادہ گنجائش ۔ ورنہ مضمون کو انشاء اللہ واشگاف کرکے دکھلا دیتا۔ مگر باوجود اس تساوی کے یہ فرق ہے کہ اہل اسلام کے پاس احادیث کی سندیں من اول الی آخرہ موجود ہیں اس زمانہ سے لے کر اوپر تک تمام راویوں کا سلسلہ بتا سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات کس قدر موجب اعتبار ہے۔ علاوہ ازیں جس زمانے تک احادیث متواتر تھیں اس زمانہ تک کے راویوں کے احوال مفصل بتلا سکتے ہیں کیونکہ اس علم میں کثرت سے کتابیں موجود ہیں۔ ہاں ایک دو روایت شاید ایسی بھی ہوں گی کہ مثل توریت و انجیل ان کی سند کا آج کل پتہ نہ لگے۔ مگر جب حضرات نصاریٰ سے مقابلہ ہے تو پھر ان روایات کے پیش کرنے میں کیا حرج۔ اس کے بعد اہل انصاف کو تو مجال دم زدن نہیں۔

اہل کتاب کی بے انصافی

یہ کیا انصاف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تو ان روایات کے بھروسے تسلیم کر لئے جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے معجزات باوجودیکہ ایسی ایسی روایات متصلہ ہوں تسلیم نہ کئے جاویں اور پھر تماشہ یہ ہے کہ ایسی بے معنی حجتیں کی جاتی ہیں کہ کیا کہئے۔

معجزات کا قرآن میں ذکر ہے یا نہ؟ اس کی تحقیق

کوئی صاحب فرماتے ہیں یہ معجزے قرآن میں مذکور نہیں۔ مگر اول تو کوئی پوچھے کہ قرآن میں مذکور ہونا جو تسلیم کے لئے ضروری ہے تو یہ ضرورت شہادت عقل ہے یا شہادت نقل۔ عجب اندھیر ہے کہ تاریخوں کی باتیں تو جن کے مصنف اکثر سنی سنائی لکھتے ہیں اور راویوں کی کچھ تحقیق نہیں کرتے اور پھر آج ان تاریخوں کی کوئی سند مصنف تک نہیں ملتی۔ حضرات نصاریٰ کے دل میں نقش کالحجر ہو جائیں اور نہ مانیں تو احادیث محمدی کو نہ مانیں؟

بعض معجزات قرآنیہ کا ذکر

علاوہ بریں اگر یہ مطلب ہے کہ کوئی معجزہ قرآن میں مذکور نہیں تو یہ ادّعا "دروغ گوئم بروئے تو" ہے۔ شق قمر اور کثرت سے پیشین گوئی جن میں سے اسلام میں خلفاء کا ہونا اور فارس سے لڑائی کا ہونا اور روم کا مغلوب ہونا اور سوائے ان کے اور موجود ہیں۔

ایمان کے لئے ایک معجزہ کافی ہے

اور اگر یہ مطلب ہے کہ سارے معجزے قرآن میں موجود نہیں تو ہماری یہ گزارش ہے کہ

ایمان کے لئے ایک ہی کافی ہے۔

مدار قبول صحت سند پر ہے، نہ خدا کے نام لگ جانے پر

علاوہ بریں مدار کار قبول روایت سند پر ہے خدا کے نام لگ جانے پر نہیں۔ ورنہ لازم یوں ہے کہ حضرات نصاریٰ سوا ان چار انجیلوں کے جتنی انجیلیں کہ اب مردود غلط سمجھتے ہیں ان سب کو واجب التسلیم سمجھیں۔ اور جب مدار کار روایت سند پر ہوا تو پھر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم واجب التسلیم ہوں گے اور توریت وانجیل واجب الانکار۔ اور سنئے کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں معجزوں کے دکھلانے سے انکار ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایسا انکار ہے جیسا انجیل میں انکار ہے۔

شق قمر کے تاریخی ثبوت کی تحقیق

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر انشقاق قمر ہوا ہوتا تو سارے جہان میں شور پڑ جاتا، تاریخوں میں لکھا جاتا۔ اول تو یہی ایک معجزہ نہیں جس کے عدم ثبوت سے بکو خلل واقع ہو۔ علاوہ بریں یہ خیال نہیں فرماتے کہ اگر ایسے وقائع میں شور عالمگیر کا ہونا لازم ہے اور تاریخوں میں لکھا جانا ضرور ہے تو اس اندھیرے کا کونسی تاریخ میں ذکر اور کہاں کہاں شور ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دینے کے دن واقع ہوا تھا اور اس ستارہ کا کون کون سی کتاب میں ذکر ہے اور کہاں کہاں شور ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کے دنوں میں نمایاں ہوا تھا اور آفتاب کے پہر بھر تک ساکن رہنے کا کہاں کہاں چرچا ہے اور کون کون سی کتاب میں مذکور ہے۔ علی ہذا القیاس اور وقائع کو خیال فرمائیے۔

علاوہ بریں دن کے واقعات اور رات کے حوادث میں عموم اطلاع کے باب میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔ خاص کر اندھیری رات کا ہو جانا کہ اس کی اطلاع تو ہر کس و ناکس کو ضرور ہے۔ انشقاق قمر کی اطلاع تو سوا ان صاحبوں کے ضروری نہیں کہ اس وقت بیدار بھی ہوں اور پھر نگاہ بھی ان کی چاندنی کی طرف ہو اور ظاہر ہے کہ یہ بات شب کے وقت بہت کم اتفاق میں آتی ہے کہ بیدار بھی ہوں اور نگاہ بھی ادھر ہو اور اگر فرض کیجئے کہ موسم سرما ہو تو یہ بات اور بھی مستبعد ہو جاتی ہے۔

علاوہ بریں طلوع قمر کے تھوڑی دیر کے بعد یہ قصہ واقع ہوا۔ اس لئے جبل حرا کے دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں حائل ہو جانے کا مذکور ہے اس صورت میں ممالک مغرب میں تو اس وقت تک عجب نہیں طلوع بھی نہ ہوا ہو۔ اور بعض بعض مواقع میں عجب نہیں کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کی آڑ میں آ گیا ہو۔ اور اس لئے انشقاق قمر اس جا پر محسوس نہ ہوا ہو۔ ہاں ہندوستان میں اس وقت ارتفاع قمر البتہ زیادہ ہوگا اور اسلئے وہاں اور جگہ کی نسبت اس کی اطلاع کا زیادہ احتمال ہے۔ مگر جیسے اس وقت ہندوستان میں ارتفاع قمر زیادہ ہوگا ویسا ہی اس وقت رات بھی آدھی ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس وقت کون جاگتا ہوتا ہے۔

سوا اس کے ہندوستانیوں کو قدیم سے اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تاریخ لکھا کریں۔ ہاں ہم تاریخوں میں موجود ہے کہ یہاں کے ایک راجہ نے ایک رات یہ واقعہ بچشم خود دیکھا ہے۔ اس سے زیادہ کیا عرض کیجئے۔ اہل انصاف کو یہ بھی کافی ہے۔ اور نا انصاف لوگ عذاب آخرت ہی کے بعد تسلیم کریں تو کریں۔

خاتمہ: حلت گوشت

مگر ہاں حضرات ہنود کے دل میں شاید ہنوز یہ خدشہ حلت گوشت کا کھٹکا ہو اور یہ خیال ہو کہ گوشت کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا سراسر ظلم ہے۔ ایک جان کے لئے اس قدر جانیں تلف کرنی کیونکر جائز ہو سکتی ہیں۔ ہاں ہم تلف بھی کاہے کے لئے کرتے ہیں ایک ذرا سی لذت کے لئے۔ یہ بھی نہیں کہ مدار زندگانی انسان حیوانات کے گوشت پر ہو۔

تحلیل لحم ظلم نہیں

اس لئے یہ گزارش ہے کہ ہم اگر بطور خود بے اجازت خداوندی جانوروں کو ذرا بھی ستائیں تو بے شک ظلم ہو۔ مگر اس کو خیال فرمایئے کہ ہم باجازت مالک الملک ان کو حلال جانتے ہیں اس کی اجازت کے بعد بھی جانور حلال نہ ہوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خداوند عالم کو جانوروں کا اختیار نہیں۔ حیوانات اس کے مملوک نہیں۔ مگر تمہیں کہو کتنا بڑا ظلم ہے کہ مالک کو اپنی چیز کا اختیار نہ ہو۔ تماشا ہے کہ جانوروں کا ذبح کرنا تو ظلم ہو اور خدا تعالیٰ کو اجازت کی ممانعت ظلم نہ ہو۔ پھر اس پر نہ معلوم سواری اور باربرداری اور دودھ پینا کون سے استحقاق پر مبنی ہے۔

گوشت کھانا انسان اور حیوان دونوں کے لئے مناسب ہے

اور اگر یہ خیال ہے کہ خدا کو تو اختیار ہے پر انسان کے واسطے ان کا حلال ہونا مناسب نہ تھا۔ تو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ مناسب اگر اس کو کہتے ہیں کہ موافق اپنے استحقاق کے کام کیجئے تو کوئی صاحب فرمائیں تو سہی کہ وہ ایسی کون سی چیز ہے کہ خدا کو اس پر استحقاق

نہیں۔ اور ایسا کون سا استحقاق ہے جو خدا کو اپنی مخلوقات پر حاصل نہیں۔ اور اگر مناسب اس کو کہتے ہیں کہ جیسے آئینہ اور پتھر میں فرق قابلیت ہے اور اس لئے آئینہ کو آفتاب زیادہ نور عطا کرتا ہے اور پتھر کو کم اور یہ فرق قابلیت یہی مناسب ہے اس کے مخالف ہو تو نامناسب ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک انسان اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے لئے یہ چیزیں حلال ہوں۔ کہنہ مکان کو اگر گرا کر دوسرا نیا عمدہ مکان بنائیں تو اس کو کوئی شخص بایں معنی نامناسب نہیں کہہ سکتا کہ پکا عمدہ مکان بنانے کے قابل نہیں۔ ایسے ہی اگر حیوانات کو ذبح کر کے اس کے گوشت سے بدن انسانی بنایا جائے تو عین صواب ہے۔ غرض بری چیز کو توڑ پھوڑ کر عمدہ چیز کا بنانا مناسب ہی نہیں بلکہ عین مناسب ہے۔ انسان کے لئے تو یوں مناسب ہے کہ اور غذائیں مادہ بعید اور گوشت مادہ قریب ہے اور اس لئے گوشت سے کامل گوشت پیدا ہو تو عجب نہیں۔ کیونکہ فضلات کے اندفاع کے بعد اور بھی صفائی کی امید ہے۔ اور حیوانات کے حق میں یوں مناسب کہ پہلے اس گوشت سے قوام جسم حیوانی تھا اب قوام جسم انسانی میسر آیا۔ جس کا یہ حاصل نکلا کہ پہلے آلہ و مرکب روح ادون تھا۔ اب آلہ و مرکب روح اعلیٰ ہو گیا اور ظاہر ہے کہ ترقی مدارج حسن ہرگز قابل گرفت نہیں۔

گوشت کھانا انسان کیلئے طبعی ہے

علاوہ بریں انسان کو مثل شیر و چیتا و بھیڑیا وغیرہ کچلیوں کا عطا کرنا خود اس جانب مشیر ہے کہ اس کی غذا اصلی گوشت ہے۔ اور اہل عقل کے نزدیک یہ بات کم از اجازت نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جتنی چیزیں دی گئی ہیں کسی نہ کسی کام کے لئے دی گئی ہیں۔ آنکھ کان جیسے دیکھنے سننے کے لئے ہیں اور اس لئے دیکھنے سننے کی اجازت ہوئی ایسے ہی کچلیوں کو بھی خیال فرمائیے۔

حلتِ گوشت میں جانوروں کی تفریق

ہاں یہ بات مسلم کہ سارے حیوانات یکساں نہیں۔ ہر کسی کے گوشت میں جدا تاثیر ہے۔ جس جانور کا گوشت مفید ہوگا وہی جائز ہوگا۔ جس جانور کا گوشت مضر ہوگا بقدر مضرت ناجائز ہوگا۔ کیونکہ خداوند کریم کے امر ونہی واجازت وممانعت آدمی کے لئے نفع ونقصان کے لحاظ سے ہے اپنے نفع ونقصان کے لحاظ سے نہیں۔ اس لئے سؤر وشیر وغیرہ درندوں کا گوشت قابل ممانعت ہے کیونکہ سؤر تو سراپا نجس دوسرے بے حیا۔ اس کی مادہ پر جس کا جی چاہے جست کرے اس کو کچھ پرواہ نہیں۔ اس لئے وہ قابل حرمت نظر آیا تاکہ اس کے کھانے سے بے حیائی نہ چھا جائے اور دل وجان ناپاک نہ ہو جائیں جس سے خیالات ناپاک پیدا ہوں۔ اور شیر وغیرہ جانوران درندہ بوجہ بداخلاق قابل ممانعت تھے، تاکہ ان کے کھانے کی تاثیر سے مزاج میں بدخلقی نہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ جیسے گرم غذا سے گرمی اور سرد سے سردی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی اخلاق وکیفیات وخواص وانوار حیوانات کو خیال فرمائیے۔

(تمت بحمداللہ تعالی والصلوۃ والسلام علی سیدنامحمدوعلی آلہ واصحابہ اجمعین. آمین)

ادارۃ العلم والتحقیق۔ بہاولپور

ہماری دیگر مطبوعہ وزیر طبع کتب

جمالِ قاسمی...... حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

عظمتِ وحی...... شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

تحریک سید احمد شہید مع اضافات...... مدثر جمال تونسوی

علاماتِ نفاق: قرآن وحدیث کی روشنی میں:

مدثر جمال تونسوی

رہنمائے تدریس وتحقیق:

مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ